قیمت : -

جولائی 2006

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

قومی اردو کونسل کی اہم مطبوعات

دیوان آبرو

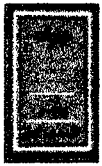

مرتب: ڈاکٹر محمد حسن

شاہ مبارک آبرو کا کلام شمالی ہند کی اردو شاعری کی اوّلین یادگاروں میں سے ہے اور اپنے دور کی عکاسی کے اعتبار سے صحیح معنوں میں گویا مرقع دہلی ہے اور جمالیاتی کیف سے بھی خالی نہیں ہے۔ یہ دیوان ڈاکٹر محمد حسن نے کلیات آبرو کے چھ دستیاب مخطوطوں کو سامنے رکھ کر مرتب کیا ہے اور اس پر مفصل مقدمہ بھی لکھا ہے۔ آخر میں فرہنگ بھی دی گئی ہے جو طلبہ اور اساتذہ دونوں کے لیے یکساں اہمیت کی حامل ہے۔

صفحات:377، قیمت:-/25 روپے

دستنبو

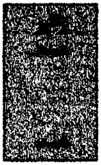

مصنف: مرزا غالب، مترجم: خواجہ احمد فاروقی

یہ مرزا غالب کی مشہور فارسی تصنیف کا اردو ترجمہ ہے جو خواجہ احمد فاروقی نے کیا ہے۔ کتاب ان واقعات کے دیدہ وشنیدہ احوال کے بیان پر مبنی ہے جو 1857 کی فوجی بغاوت کے دنوں میں دار السلطنت دہلی میں رونما ہوئے۔

صفحات:88، قیمت:-/12 روپے

تذکرہ گلشن ہند

مصنف: مرزا علی لطف

یہ شعرائے اردو کا مشہور تذکرہ ہے جو مرزا علی لطف نے جان گلکرسٹ کی فرمائش پر علی ابراہیم خاں کے فارسی تذکرے "گلزار ابراہیم" کو سامنے رکھ کر ضروری اضافوں کے ساتھ اردو میں مرتب کیا تھا۔ 1906 میں یہ تذکرہ علامہ شبلی نعمانی کی تصحیح اور مولوی عبدالحق کے مقدمے کے ساتھ حیدرآباد دکن سے شائع ہوا۔

صفحات:308، قیمت:-/90 روپے

پنجاب میں اردو

مصنف: محمود خاں شیرانی

پروفیسر محمود خاں شیرانی کو اردو تحقیق کا معلم اول کہا جاتا ہے۔ "پنجاب میں اردو" ان کی مشہور ترین کتابوں میں سے ہے۔ اردو کے آغاز وارتقا میں پنجاب اور اہل پنجاب کا جو حصہ ہے، اس کتاب میں پہلی بار اس کی نشاندہی کی گئی ہے اور تاریخی اور لسانی شواہد کی روشنی میں ان حقائق کو پیش کیا گیا ہے جو اس موضوع کو استحکام بخشتے ہیں۔

صفحات:287، قیمت:-/110 روپے

سخن دان فارس

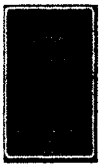

مصنف: محمد حسین آزاد

محمد حسین آزاد کو لسانی تاریخ سے خصوصی شغف تھا، یہ کتاب جو صرف فارسی زبان وادب کی تاریخ ہی نہیں، ان تہذیبی، تمدنی اور نسلی رشتوں کا حوالہ بھی ہے جو اہل ہند اور اہل ایران کے درمیان زمانہ قدیم سے موجود ہیں اور آج بھی جن کی تازگی پر کہنگی پوری طرح غالب نہیں آسکی ہے۔ آزاد کے مخصوص اسلوب تحریر نے تاریخی حقیقتوں کے بیان کو بھی افسانوی دلکشی بخش دی ہے۔

صفحات:364، قیمت:-/134 روپے

اتحاد سے انتشار کی طرف

مصنف: پروفیسر مشیر الحسن

اودھ کی کم ہوتی ہوئی قصباتی تہذیب اس ہندایرانی ثقافتی ورثے کی امین رہی ہے جو ہمارے صدیوں کے ثقافتی میل جول کی دین تھا۔ پروفیسر مشیر الحسن کی یہ کتاب جو ایک مورخ کے نقطہ نظر سے لکھی گئی ہے مختلف مذہبی فرقوں کے ان باہمی تعلقات پر روشنی ڈالتی ہے جو کثرت میں وحدت کی آئینہ داری کرتے تھے۔ قصبات کی روزمرہ کی زندگی، رسم ورواج، سماجی اور مذہبی تقریبات، ان سب چیزوں کا ایسا دانشورانہ بیان جو دلچسپ بھی ہے اور خیال انگیز بھی۔

صفحات:415، قیمت:-/216 روپے

افغانستان میں جدید دری (فارسی) شاعری

مصنف: ڈاکٹر غلام محمد لعل زاد

یہ کتاب ڈاکٹر غلام محمد لعل زاد کے فارسی تحقیقی مقالے پر مبنی ہے جسے ڈاکٹر شعیب اعظمی نے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ اس کے مطالعے سے افغانستان کی جدید فارسی شاعری اور موجودہ دور کے اہم شاعروں سے واقفیت ہوتی ہے۔ ہندوستان میں فارسی زبان و ادب کے طلبہ اور فارسی زبان وادب سے دلچسپی رکھنے والے شائقین کے لیے یہ کتاب ایک اہم تحفے سے کم نہیں۔

صفحات:317، قیمت:-/80 روپے

پرواز

مصنف: ڈاکٹر اے. پی. جے. عبدالکلام

ترجمہ اور تلخیص: گلزار (نقل حرفی۔ فرحانہ محمود)

صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر اے. پی. جے. عبدالکلام کی خود نوشت سوانح عمری "پرواز" نہ صرف ڈاکٹر کلام کی نجی زندگی کی روداد ہے بلکہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں آزاد ہندوستان کی تدریجی پیش رفت کی کہانی بھی بیان کرتی ہے۔ ان ولولہ انگیز واقعات وحقائق پر مشہور مصنف اور فلم ڈائرکٹر جناب گلزار نے یہ دلچسپ سی. ڈی. (آڈیو ورژن) تیار کی ہے۔

قیمت (کتاب مع سی. ڈی.):-/175 روپے

نوٹ:- طلبہ کے لیے 45 فیصد اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

ماہ نامہ

اردو دنیا نئی دہلی

جلد-8، شمارہ-7 جولائی 2006

مدیر: ڈاکٹر آر. کے. بھٹ

معاون مدیر: ڈاکٹر فیروز عالم

ناشر اور طابع:
پرنسپل پبلی کیشن آفیسر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ ثانوی واعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

کمپوزنگ: اسد نیاز، بہلول احمد
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک-1، ونگ-6
آر.کے.پورم، نئی دہلی- 110 066
فون: 26103381, 26103938
26179657 فیکس: 26108159
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urducoun@ndf.vsnl.net.in

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر.کے.پورم، نئی دہلی-110066
فون: 26109746, 26169416

شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 5-1، چھتہ گلی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

آپ کی بات 2

ہماری بات 5

روبرو

● علی رفاد فتیحی سے گفتگو .... فیروز عالم 8

زبان اور تعلیم

● چند غیر روایتی تدریسی طریقے .... اعجاز مسیح 12

● اردو نصاب— سیکنڈری اور سینئر سیکنڈری سطح پر .... ریاض احمد 20

● لڑکیوں کی تعلیم .... اشوک گانگولی 24

● وہ بچپنے کی نیند تو اب خواب ہوگئی .... وودھا کول 26

● اردو طباعت کا سفر .... رضاء الرحمن عاکف 28

سائنس اور صحت

● مشن 2007 .... ایم. ایس سوامی ناتھن 30

● تمباکو نوشی .... محمد عمر رضا 33

تاریخ

● دو قومی نظریے کا خاتمہ .... مدن گوپال 35

صحافت

● اشتہارات کے ذریعے معلومات و پیامات کا فروغ .... سید مزمل الدین 38

شخصیات

● اسٹیفن ہاکنگ .... ندیم احمد 40

قانون

● طبی لاپروائی اور قانون تحفظ صارفین .... عبدالواحد 42

ادب

● داش آکل (فارسی کہانی) .... صادق ہدایت 46

ہماری مطبوعات سے

● سرسید کا بچپن ("حیات جاوید" سے ماخوذ) .... خواجہ الطاف حسین حالی 52

● قوموں کی تقدیر ("آدمی میں چراغ" سے ماخوذ) .... خواجہ غلام السیدین 57

طلبہ کے لیے

● فائر انجینئرنگ میں کیریئر .... زبیر احمد بھاگلپوری 61

● جنوبی ایشیائی علاقائی تعاون کی تنظیم (سارک) .... درگھ پال سنگھ بھنڈاری 63

اردو خبرنامہ .... ادارہ 67

تبصرہ و تعارف .... کتابوں پر تبصرے 73

بچوں کا گوشہ

● چوہے میاں کی شادی ("بے زبانوں کی دنیا" سے ماخوذ) .... حیدر بیابانی 78

● سونے کی بطخ .... احمد نسیم صدیقی 79

آپ کی بات

■ **یوسف ناظم، 19۔الہلال، 13۔باندرہ ریکلیمیشن، ممبئی۔400050**

جون 2006 کے شمارے میں اسد فیض کا کیا عمدہ مضمون آپ نے اپنے رسالے میں شائع کیا ہے لیکن ایک زیادتی یہ کی ہے کہ ان کا پتہ دینے میں آپ نے تکلف کیا۔ اسد فیض نے گھر بیٹھے پاکستان کی ادبی کائنات کی سیر کروادی۔ یہ بھی اس سبب ہوا کہ پڑوسی ملک میں اچھی، نفیس کتابوں کی اشاعت کا معاملہ عروج پر ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے قاریوں کا بھی موازنہ کیا جائے کہ وہاں مطالعہ کنندگان کی شرح زیادہ ہے یا یہاں پر۔ مرحوم نوشاد علی سے متعلق سرور یوسف کا مضمون بھی اچھا ہے لیکن ان کے ساتھ بھی آپ نے وہی سلوک کیا جو اسد فیض کے ساتھ کیا۔ غلام علی کا انٹرویو (ترجمہ) بھی دلچسپ ہے۔ خاص طور پر اس انٹرویو میں بھیم سین جوشی کے ساتھ ان کا مکالمہ دل کو چھو گیا۔ بھیم سین جوشی کے ہاتھوں سے شال اوڑھ کر غلام علی کتنے خوش ہوئے ہوں گے۔

وہاب قیصر (اتفاق سے میرے دوست ہیں) کا مضمون معلوماتی ہے لیکن ایک بات یہ سمجھ میں نہیں آرہی ہے کہ ہر معاملے میں خواتین کی صف الگ کیوں بنائی جارہی ہے۔

حکیم اشہر قدیر کا مضمون بعنوان ''قبض'' کو معمر اور کمسن قاریوں کو پڑھنا ہی چاہیے۔ یہ اس لحاظ سے قبض رساں مضمون ہے بشرطیکہ مضمون کے مندرجہ نسخوں پر عمل کرنے کی توفیق ہو۔

ناول ''لفٹ'' پر تبصرے نے للچایا کہ یہ ناول پڑھنا ہی چاہیے۔ -/10 روپے میں آپ اپنے رسالے کو بقعۂ نور بنا دیتے ہیں۔ مبارک ہو۔

■ **شہاب ظفر اعظمی، شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ۔800005**

''اردو دنیا'' کا تازہ شمارہ (جون 2006) نظر نواز ہوا، حسب سابق یہ شمارہ بھی صوری و معنوی اعتبار سے پرکشش اور معیاری ہے۔ سرورق پر موسیقار اعظم نوشاد کی خوب صورت تصویر اس کے حسن میں چار چاند لگا رہی ہے۔ ہندوستانی فلمی موسیقی میں نوشاد کا نام سنہرے حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے جنھوں نے کلاسیکی موسیقی کو فلمی دھنوں کا حصہ بنایا اور سیکڑوں دلوں کو چھو لینے والے نغموں سے فلم صنعت کو باوقار بنایا۔ آپ نے ''ہماری بات'' میں اختصار اور جامعیت کے ساتھ نوشاد صاحب کی زندگی اور ان کے کارناموں کا بڑی خوب صورتی سے احاطہ کر کے دریا کو کوزے میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ نوشاد صاحب کی زندگی نوجوانوں کے لیے بھی مشعل راہ ہے کہ انسان میں ہمت اور حوصلہ ہو تو وہ ہر دشواری اور امتحان سے گزر کر کامیابی کی منزل ضرور پا لیتا ہے۔ نوشاد عزم و حوصلہ اور محنت و مشقت کی بہترین مثال تھے جنھوں نے ممبئی کے فٹ پاتھ سے دادا صاحب پھالکے اعزاز تک کا سفر اپنی محنت، حوصلہ اور موسیقی سے جنون کی حد تک عشق کی بدولت طے کیا۔

''روبرو'' کے تحت ''غلام علی'' اور ''جان میکلنسن'' سے گفتگو دلچسپ ہے۔ غلام علی سے گفتگو مختصر ہوتے ہوئے بھی چند دلچسپ سوالات کی وجہ سے خوب صورت لگی۔ پنڈت بھیم سین جوشی سے غلام علی کی ملاقات کا واقعہ ان قدروں کی یاد دلاتا ہے جو آہستہ آہستہ ہمارے درمیان سے ختم ہو رہی ہیں۔ جان میکلنسن نے پینگوئن کے زیر اہتمام شائع ہونے والی کتابوں اور اشاعت کے مسائل پر کھل کر گفتگو کی ہے۔ بالخصوص ڈیجیٹل ٹکنالوجی سے کتابوں کی تجارت پر پڑنے والے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ ان کا کہنا صحیح ہے کہ ہر نئی چیز ایک Tipping Point پر پہنچتی ہے۔ مگر جلد ہی ایسا وقت واپس آئے گا جب لوگ ''جنگ اور امن'' جیسی کتابوں کو الیکٹرانک آلے کے بجائے کتاب کے ذریعے ہی پڑھنا پسند کریں گے۔

زبان اور تعلیم کے ذیل میں جو مضامین شائع ہوئے ہیں ان میں فرید احمد برکاتی کا مضمون ''اردو میں مستعمل عربی مرکبات کیسے پڑھیں'' سب سے اہم ہے۔ اردو زبان، املا اور تلفظ کا عربی و فارسی زبانوں اور اصول و قواعد سے گہرا تعلق ہے مگر ہمارے تعلیمی اداروں میں رائج نصابات اور طریقۂ تدریس کی وجہ سے اردو کے طلبہ عام طور پر عربی و فارسی کی بنیادی معلومات سے بھی نابلد ہوتے ہیں۔ اس قسم کے مضامین سے انھیں اردو میں رائج عربی و فارسی الفاظ کے صحیح املا، تلفظ اور معانی سے واقفیت ہوسکتی ہے۔ اس لیے ''اردو دنیا'' کے ہر شمارے میں اس قسم کا ایک مضمون ضرور شائع ہونا چاہیے۔ وہاب قیصر نے ''خواتین اور کمپیوٹر ٹکنالوجی'' میں صحیح کہا ہے کہ زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں رہا جس پر کمپیوٹر اثر انداز نہ ہوا ہو۔ یہ ٹکنالوجی عصر حاضر کی سماجی، معاشی، سیاسی، ثقافتی اور خانگی زندگی کے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ مگر یہ حقیقت افسوسناک ہے کہ اس اہم شعبے میں مردوں کے مقابلے میں خواتین کی حصے داری بہت کم رہی ہے۔ وہاب قیصر نے کمپیوٹر ٹکنالوجی سے متعلق جن خواتین اور ان کے کارناموں کا ذکر کیا ہے وہ لائق تحسین ہیں۔ امید کہ اس مضمون کو پڑھ کر ہندوستانی لڑکیاں بھی کمپیوٹر ٹکنالوجی کی طرف راغب ہونے کی کوشش کریں گی کیونکہ اس میں بھی اپنے فن کا مظاہرہ کر کے شہرت، دولت اور اعلیٰ عہدے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ اسد فیض نے 2005 کی اہم پاکستانی مطبوعات کا اجمالی جائزہ پیش کیا ہے۔ چونکہ ہم پاکستانی

مطبوعات کے مطالعے سے محروم رہ جاتے ہیں اس لیے یہ جائزہ مختصر اور تشنہ ہوتے ہوئے بھی ہمارے جذبۂ شوق کو برانگیختہ ضرور کر گیا ہے۔

اقبال محی الدین کا مضمون سمندری طوفان کے اسباب وعوامل سمجھانے میں بہت حد تک کامیاب ہے۔ 26 دسمبر 2004 کی سنامی کے بعد اس کی طرف زیادہ سنجیدگی سے توجہ دی جارہی ہے۔ اقبال صاحب نے اپنے مضمون میں جن حقائق کا اظہار کیا ہے وہ حیرت انگیز بھی ہیں اور خوفناک بھی۔ ضرورت ہے کہ ان سے تحفظ کے موثر طریقے جلد از جلد دریافت کر لیے جائیں۔ قبض ایک عام اور بے حد تکلیف دہ مرض ہے، حکیم اشہر قدیر نے اس کے اسباب پر جامع گفتگو کی ہے۔ سید اقبال امروہوی نے ہنری برگساں کے فلسفیانہ خیالات اور نظریات کا اچھا تعارف پیش کیا ہے۔ فرانسیسی مفکر برگساں اپنے خیالات اور نظریات کی وجہ سے ہر عہد میں مشہور رہا ہے اور بڑے بڑے ادبا، شعرا اس کے نظریات سے استفادہ کرتے رہے ہیں۔

سید امتیاز الدین اور سرور یوسف نے نوشاد کی شخصیت کے متنوع جہات کو خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ ادبی گوشے میں انجم مانپوری کے ''کرائے کی ٹم ٹم'' سے میں بے حد محظوظ ہوا۔ یہ ان کا لافانی شاہکار ہے۔ اسی طرح ''توبۃ النصوح'' سے ماخوذ حصہ بھی نذیر احمد کی تحریر کا عمدہ نمونہ ہے۔ طلبہ کے لیے کیریئر اور کمپیوٹر کی باتیں حسب معمول اہم اور معلوماتی ہیں۔

تبصرہ و تعارف میں پروفیسر قمر رئیس نے ''گفتگو ان کی'' پر جو گفتگو کی ہے وہ کتاب اور صاحب کتاب دونوں کو متعارف کراتی ہے اور اپنی طوالت کے سبب تبصرے کے بجائے مضمون کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ دوسرا تبصرہ فیروز عالم کا ہے جس میں انھوں نے ناول ''لفٹ'' کے موضوع، اسلوب، فکر اور رجحان کا بہت جامع اور غیر جانبدارانہ جائزہ پیش کیا ہے۔ یہ ناول رشوت خوری، خوشامد پسندی اور غیر اخلاقی حرکات پر بے لاگ اور بے باک رائے زنی کرتا ہے۔ عبدالرب، عبیدالرحمٰن اور مصحف اقبال توصیفی کے تبصرے بھی کتابوں کا تعارف کرانے میں کامیاب ہیں۔

بچوں کے گوشے میں ''ترکی ٹوپی'' بہت دلچسپ ہے۔ تسنیمہ زیدی فن ترجمہ نگاری سے خوب واقف ہیں۔ انھوں نے ترجمے میں تخلیق کی روانی قائم رکھی ہے۔ اس معیاری اشاعت پر مبارکباد قبول فرمائیں۔

■ **محمد ہاشم قدوائی، بی-501، روز ووڈ اپارٹمنٹ، میور وہار، نئی دہلی**

جون 2006 کا شمارہ موصول ہوا۔ اس کے معلوماتی اور پر مغز مضامین سے مستفید ہوا خاص طور سے اردو میں مستعمل عربی مرکبات کیسے پڑھیں، 2005 کی اہم پاکستانی مطبوعات، سمندری طوفان، نوعیت اور اسباب، چیچک کا حملہ، کرائے کی ٹم ٹم، نصوح اور منجھلے بیٹے علیم کی گفتگو، اردو خبر نامہ اور تبصرہ و تعارف سے اتنے مفید اور معلوماتی مضامین شائع کرنے پر دلی مبارکباد قبول کریں۔

■ **شاغل ادیب، مذہب منزل، 1-4-304/9/3، صدیق نگر، مشیر آباد، حیدرآباد-48**

''اردو دنیا'' جون 2006 کے اداریے سے شہنشاہ موسیقی نوشاد علی مرحوم سے نہ صرف آپ کی گہری عقیدت کا پتہ چلتا ہے بلکہ یہ آپ کی فن موسیقی سے متعلق اچھی خاصی جانکاری کا بھی غماز ہے۔ مرحوم پر سید امتیاز الدین اور سرور یوسف کے مضامین بھی اچھے ہیں۔ دیگر مشمولات میں دونوں انٹرویو، اسد فیض کا مضمون ''2005 کی اہم پاکستانی مطبوعات'' اور سید اقبال امروہوی کا مضمون ''ہنری برگساں'' بھی پسند آئے۔ طنز و مزاح میں انجم مانپوری کی ''کرائے کی ٹم ٹم'' بڑا لطف دے گئی۔ یہ واقعی سنجیدہ ظرافت کا اچھا نمونہ ہے۔ آپ کی ادارت میں ''اردو دنیا'' خوب سے خوب تر کی جانب رواں دواں ہے۔

■ **ڈاکٹر مجیب الرحمٰن، میرا روڈ بھتانہ (مہاراشٹر)**

''اردو دنیا'' جون کا شمارہ ملا۔ حسب معمول تمام مضامین معیاری ہیں۔ نوشاد علی پر آپ نے اتنی جلد گوشہ پیش کر دیا۔ یہ آپ کی صحافتی خوبیوں کی نشاندہی کرتا ہے۔

سید اقبال امروہوی کا مضمون ''ہنری برگساں'' پر بہت ہی جامع اور مربوط ہے۔ ایسے مشاہیر کا نام تو اکثر پڑھتے ہیں لیکن آپ نے ان کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔ باقی مواد بھی حسب معمول معیاری ہے۔ آپ اردو کی جو خدمات انجام دے رہے ہیں وہ ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

فروری کے شمارے میں یوں تو تمام مضامین قابل تعریف ہیں لیکن ''معذور انسان اور کامیاب شخصیت'' کے عنوان سے جو مضمون شامل کیا گیا ہے وہ بہت عمدہ ہے اور اگر غور کیا جائے تو ایسے لوگوں کے لیے مشعل راہ ہے جو اپنی کسی کمزوری کی وجہ سے احساس کمتری کا شکار ہیں۔

■ **شعیب انصاری، 56، اندر پریس سوسائٹی سیان ایسٹ، ممبئی-22**

جون کا اردو دنیا نظر نواز ہوا۔ مشمولات بے حد پسند آئے۔ آپ اردو کے لیے جو کچھ کر رہے ہیں وہ لائق تحسین ہے۔ جون کے شمارے میں آپ کا اداریہ بہت پسند آیا۔ فرید احمد برکاتی صاحب کا مضمون بہت عمدہ ہے۔ عربی مرکبات کے تلفظ میں اکثر غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ اس مضمون سے اب ان غلطیوں کے امکانات کم ہو جائیں گے۔ مرحوم نوشاد علی پر مضامین بھی خوب ہیں۔ شخصیات کے تحت سید اقبال امروہوی کا مضمون ہنری برگساں فلسفی اور سیاست داں ایک جامع اور معلوماتی مضمون ہے اور بڑی محنت سے لکھا گیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ شمارہ بہت عمدہ ہے۔

■ **نامی انصاری، 99/295، نالہ روڈ، چمن گنج، کانپور-1**

رشید حسن خاں پر آپ نے جو گوشہ شائع کیا ہے وہ لائق تحسین ہے۔ ان کے تحقیقی استناد پر تو کوئی سوال مشکل ہی سے اٹھایا جا سکتا ہے لیکن ان کی شخصیت میں جو

کھا نچے تھے، ان پر پروفیسر قمر رئیس نے جو باتیں لکھی ہیں ان کی تصدیق مخمور سعیدی اور پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کے مضامین سے بھی ہوتی ہے۔ حد تو جب ہوئی جب رشید حسن خاں نے خواجہ احمد فاروقی کو بھی نہیں بخشا جو ان کے محسن تھے اور دہلی یونیورسٹی میں ان کی تقرری کا باعث بھی۔ بہر حال ان میں خوبیاں بھی تھیں اور خاص کر تحقیقی سروکاروں میں تو ان کا جواب ہی نہ تھا۔

میری دو مرتبہ ان سے ملاقات ہوئی۔ ایک مرتبہ شاہجہانپور میں ان کے مکان پر اور دوسری مرتبہ لکھنؤ میں اور دونوں بار میں ان کی خوش خلقی سے متاثر اور ممنون ہوا۔

■ **عبدالوحید چوہان، سرہندی گیٹ، مالیر کوٹلہ۔ 148023**

جون 2006 کا شمارہ دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ اس میں کئی مضامین بہت ہی اچھے ہیں۔ مثلاً "اردو میں مستعمل عربی مرکبات کیسے پڑھیں" "قبض اسباب اور علاج" "کرائے کی ٹم ٹم" "ترکی ٹوپی" "غلام علی سے گفتگو" اور نوشاد علی سے متعلق مضامین۔ اس کے لیے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

■ **غلام حسنین باقری، تکیہ دیوان شاہ، مومن پورہ، ناگپور، (مہاراشٹر)۔ 18**

مئی 2006 کا اردو دنیا نظر نواز ہوا۔ "ہندوستانی میڈیا کا بدلتا چہرہ" کے عنوان سے رضوان احمد نے جو واقعات اور نتائج قارئین کے لیے پیش کیے ہیں در اصل یہ ہندوستانی میڈیا کا اصلی چہرہ ہے نہ کہ بدلتا چہرہ۔ "اردو خبر نامہ" بھی بے حد معلوماتی ہے۔

رضوان رضوی نے "منزل قریب ہے" کے عنوان سے مثبت انداز میں تعلیم یافتہ بے روزگار شہری کے مختلف تاریخی حوالوں کو پیش کرتے ہوئے مہمیز کرنے کا کام کیا ہے جو قابل تعریف ہے۔

■ **تمنا مظفر پوری، جمیل کمپاؤنڈ، بمن پورہ، بی. وی. کالج پٹنہ۔ 800014**

اردو دنیا مئی کا شمارہ نظر نواز ہوا تمام مشمولات قابل مطالعہ ہیں۔ اس شمارے میں آپ نے رضوان رضوی کا مضمون "منزل قریب ہے" یعنی باپ کا خط بیٹے کے نام شائع کر کے بہت بڑا کام کیا ہے۔ بہت ہی اہم مضمون ہے۔ رضوان رضوی صاحب کو میری طرف سے مبارک باد۔ یہ مضمون مئی کے شمارے کا حاصل ہے۔

■ **محمد عابد انور، پی. جی. شعبۂ اردو، رانچی یونیورسٹی، رانچی (جھارکھنڈ)**

مئی کے شمارے میں "منشا یاد" سے اسد فیض کی گفتگو بہت عمدہ ہے۔ اس گفتگو میں منشا یاد نے افسانہ نگاری کے متعلق کئی اہم باتوں پر روشنی ڈالی ہے۔ "منشا یاد" نے دیہات کی زندگی اور کسانوں کے مسائل کی عکاسی اپنے افسانوں میں کی ہے۔

کمپیوٹر سے تدریس نو جوانوں کے لیے کارآمد مضمون ہے۔ رضوان رضوی کا مضمون ہمت اور عزم کو بیدار کرنے والا ہے۔ میں نے اس مضمون کا کئی بار مطالعہ کیا۔ تمام نو جوانوں کو اس مضمون کو ضرور پڑھنا چاہیے۔

■ **انوار انصاری، چوہا محلہ، اولڈ ہزاری باغ روڈ شانتی نگر، رانچی، جھارکھنڈ۔**

"ہماری بات" کے تحت آپ نے بے حد اہم باتوں پر اظہار خیال کیا ہے۔ اکیسویں صدی میں اردو زبان و ادب اور تعلیم کی خاطر خواہ ترویج و ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ کونسل اور ریاستی اردو اکادمیاں ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر کام کریں۔ ریاستی اردو اکادمیوں کی رابطہ کمیٹی تشکیل دی جائے جو تمام اکادمیوں سے مسلسل تال میل رکھے اور کونسل کو بھی اپنی سرگرمیوں سے باخبر رکھے۔ اس سے ملک میں اردو کی ترقی کی رفتار تیز ہوگی۔

"سنڈے ہو یا منڈے روز کھائیں انڈے" عبید الرحمٰن کا یہ مضمون بہت ہی عمدہ ہے۔ اس مضمون کو میں نے کئی بار پڑھا اور گھر میں بچوں اور خواتین کو بھی بتایا۔ واقعی انڈے کی افادیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔

بچوں کے گوشے کے تحت دونوں مضامین بے حد اچھے ہیں۔ "چھوٹی ای" تو لاجواب کہانی ہے۔ بچوں اور بڑوں کے لیے بے حد مفید ہے۔ ایسے مضامین کی سخت ضرورت ہے جن سے ہمارے اخلاق پر اچھا اور مثبت اثر پڑتا ہے۔

رضوان احمد کا مضمون "ہندوستانی میڈیا" کا بدلتا چہرہ قاری کو اہم معلومات فراہم کراتا ہے ہمارے ملک میں میڈیا کی مسلسل توسیع ہو رہی ہے اور اس سے بہت اہم کام لیا جا رہا ہے۔ تمام مضامین اپنی جگہ نگینے کی مانند جگمگا رہے ہیں۔ ایسے عمدہ شمارے پر آپ کو بے حد مبارکباد۔

■ **محمد ناظم علی، نظام آباد، آندھرا پردیش**

"اردو دنیا" اپریل کا شمارہ موصول ہوا۔ اس میں رشید حسن خاں پر گوشہ شائع کر کے ان کی حیات اور کارناموں کو اجاگر کیا ہے۔ چند روز قبل جون 2006 کا شمارہ ملا جس میں نوشاد صاحب کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ فلمی دنیا کو نوشاد کی دین کلاسیکی موسیقی ہے۔ انھوں نے اپنی تربیت کے ذریعے کئی موسیقار پیدا کیے۔ غلام علی سے گفتگو معلوماتی ہے اور "اردو میں مستعمل عربی مرکبات" قارئین اردو دنیا کے لیے مفید ہے۔

□□□

مراسلات اور مضامین صاف اور خوش خط ارسال فرمائیں۔
(ادارہ)

ہماری بات

ہم روزانہ صبح چھوٹے چھوٹے بچوں اور بچیوں کو وزنی تھیلا پشت پر لٹکائے اسکول جاتے دیکھتے ہیں۔ دونوں ہاتھ آگے کو جھکے ہوئے، ان کا بدن کمان کی مانند نظر آتا ہے۔ بھاری بستہ انھیں سیدھا کھڑا ہو کر چلنے نہیں دیتا۔ بچوں کے بہتر مستقبل کے خواہاں والدین کو شاید اس پر غور کرنے کی فرصت نہیں ملتی کہ روزانہ ضرورت سے زیادہ وزنی تھیلا اٹھا کر چلنے سے ان بچوں اور بچیوں پر کیا گزرتی ہے اور آہستہ آہستہ وہ کس طرح پیٹھ اور کمر کے درد کا شکار ہو رہے ہیں۔ اگر اس جانب فوری توجہ نہ دی گئی تو مستقبل میں اس کے نہایت سنگین نتائج سامنے آسکتے ہیں۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ زیادہ وزنی تھیلا لے کر چلنے کی وجہ سے بچوں کی ریڑھ کی ہڈی ٹیڑھی ہوسکتی ہے، گردن، کندھا اور کندھے کے نچلے حصے اور ریڑھ کی ہڈی کے نچلے حصے میں شدید درد ہوسکتا ہے اور عضلات پر بھی اس کے منفی اثرات مرتسم ہو سکتے ہیں۔ نفسیاتی اعتبار سے بھی یہ نقصان دہ ثابت ہو رہا ہے اور بہت سے بچے اسکول جانے سے کترانے لگے ہیں۔

گذشتہ دنوں انگریزی روزنامے "ٹائمس آف انڈیا" نے ایک سروے میں مختلف درجات کے بچوں کے تھیلوں کا وزن کرایا تو پتہ چلا کہ ان کے کندھوں پر مجوزہ وزن کے مقابلے میں ڈھائی سے تین گنا زیادہ وزنی تھیلے لٹکے ہوئے ہیں۔ ابتدائی درجات کے طلبہ کا تھیلا دو ڈھائی کیلوگرام ہونا چاہیے جب کہ وہ اوسطاً ساڑھے پانچ کیلوگرام ہے۔ ثانوی درجات کے طالب علموں کے تھیلوں کا وزن زیادہ سے زیادہ ساڑھے تین کیلوگرام ہونا چاہیے جب کہ وہ اوسطاً ساڑھے دس کیلوگرام تک کا ہے۔ اس تھیلے میں گھر کے کام (ہوم ورک) اور اسکول کے کام (کلاس ورک) کے لیے ہر مضمون کی الگ الگ کتابیں اور کاپیاں ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ لنچ بکس اور پانی کی بوتل کا وزن بھی ان بچوں کو اٹھانا ہوتا ہے۔

دہلی کے اندر پرستھ اپولو اسپتال نے اس سلسلے میں دس سے پندرہ سال تک کے 1134 بچوں کا سروے کرایا جس میں پایا گیا کہ 38.04 فیصد بچے ریڑھ کے نچلے حصے میں درد سے پریشان تھے۔ یہ اعداد و شمار اب تک کرائے گئے ہر سروے کے نتائج سے زیادہ اور چونکانے والے ہیں۔ اس سے مسئلے کی سنگینی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

دہلی کے برلا ودیا نکیتن میں ساتویں جماعت کے طالب علم تمیش گرگ نے روزانہ دس کیلوگرام وزنی تھیلا پشت پر لادنے کی بجائے پہیوں والا تھیلا اسکول لے جانا شروع کر دیا ہے۔ تمیش کا کہنا ہے کہ "میری پیٹھ میں اکثر درد ہو جاتا تھا۔ اس کی وجہ سے مجبوراً مجھے اس تھیلے کا سہارا لینا پڑا۔ اس سے مجھے بڑی راحت ملی ہے۔" دیگر بچوں نے بھی اس طرح کے تھیلوں کا سہارا لینا شروع کر دیا ہے۔ بعض والدین خود ہی بچوں کا تھیلا لے کر انھیں اسکول پہنچاتے ہیں لیکن یہ سہولت بہت ہی چھوٹے بچوں عموماً ابتدائی اور پہلی یا دوسری جماعت کے بچوں کو ہی میسر ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ ہمارے ماہرین تعلیم اور دانشوروں نے اس پر توجہ نہیں دی ہے۔ مشہور انگریزی ادیب آر.کے. نارائن نے پارلیمنٹ میں اس مسئلے کی طرف ارباب اختیار کو متوجہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ "میں اسکول بیگ کو ہٹانے کی گزارش کر رہا ہوں۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے ہر بچہ اپنی پشت پر اوسطاً چھ سے آٹھ کیلوگرام وزن باربردار خچر کی مانند لاد کر چلتا ہے۔" یشپال کمیٹی نے تو صرف بستے کے بوجھ کی طرف ہی اشارہ نہیں کیا تھا بلکہ نصاب کو بھی بچوں کی عمر اور ذہانت کے مدنظر آسان بنانے کا مشورہ دیا تھا۔ لیکن شاید بہتر کیریئر کی آرزو اور زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جانے کے خدشات اس ضمن میں سدِ راہ بنتے رہے ہیں۔ بچوں کی پشت سے اسکول بیگ اتارنے کی کوشش ہمارے ملک میں کافی عرصے سے جاری ہے۔ 1997 کی ایشور بھائی پٹیل کمیٹی سے لے کر 1993 میں پیش کی گئی یشپال کمیٹی کی رپورٹ اور ریویو کمیٹی کی تمام سفارشوں میں یہی کہا گیا ہے کہ طالب علموں کو بھاری بھرکم بستے سے جلد از جلد نجات دلائی جائے لیکن اب تک اس پر کوئی بامعنی پیش رفت نہیں ہوسکی ہے۔

بعض اسکولوں نے اس مسئلے کا یہ حل نکالا ہے کہ طالب علموں کے لیے لاکر کا انتظام کیا جائے لیکن ابھی یہ بے حد محدود پیمانے پر ہو رہا ہے اور اس کا دائرہ صرف بڑے شہروں اور بڑے اسکولوں تک محدود ہے۔ اس میں ایک قباحت یہ بھی ہے کہ بچوں کے لیے کتابوں اور نوٹ بک کے دو سیٹ (اسکول اور گھر کے لیے الگ الگ) خریدنے پڑیں گے جو ظاہر ہے کہ تمام والدین کے لیے آسان نہ ہوگا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نصاب کو آسان بنایا جائے اور ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے بچوں کو زیادہ وزنی تھیلا بھی نہ ڈھونا پڑے اور ان کی صلاحیتوں میں بھی اضافہ ہو۔ تعلیمی عمل کو بچوں کے لیے دلچسپ بنانے کی کوشش کی جائے تاکہ وہ اسکول جانے سے کترانے کی بجائے خوش خوش اسکول جائیں اور آموزشی عمل ان کے لیے بوجھ نہ بنے۔

□□□

قومی اردو کونسل کی مندرجۂ ذیل مطبوعات پر 75فیصد کی خصوصی رعایت

نمبر شمار	کتاب کا نام	قیمت	قیمت مابعد رعایت 75%
01.	آزادی	52.00	13.00
02.	آزادی کے بعد سائنس اور ٹکنالوجی	123.00	31.00
03.	افغانستان میں جدید دری فارسی شاعری	80.00	20.00
04.	عہد ناظم کتب خانہ داری ایک تعارف	55.00	14.00
05.	علی وردی اور اس کا عہد	86.00	22.00
06.	عشری درجہ بندی	167.00	42.00
07.	آڈیٹنگ کے بنیادی اصول	331.00	83.00
08.	برقی توانائی	94.00	24.00
09.	بھارت 2001	250.00	63.00
10.	بھارت 2002	250.00	63.00
11.	چولا راجگان	209.00	52.00
12.	ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا: حیات اور کارنامے	69.00	17.00
13.	فلسفیانہ تجزیہ: ایک تعارف	120.00	30.00
14.	فیودر دستوئیفسکی	52.00	13.00
15.	غرائب الجمل	76.00	19.00
16.	گلشنِ بے خار	128.00	32.00
17.	ہمارا قدیم سماج	54.00	14.00
18.	ہندوستان کا نظامِ جمال (جلد اول، دوم، سوم)	1311.00	328.00
19.	ہندوستان کی خارجہ پالیسی کی بنیادیں	33.00	08.00
20.	ہندوستان کی قانونی تاریخ (جلد اول، دوم)	262.00	66.00
21.	ہندوستان میں چھاپہ خانہ	52.00	13.00
22.	ہندوستانی سیاسی نظام کا تدریجی ارتقا	95.00	24.00
23.	ہندوستانی معیشت	134.00	34.00
24.	ہندوستانی مصوری عہد مغلیہ میں	158.00	40.00
25.	ہندوستانی مصوری: ایک خاکہ	130.00	33.00
26.	حیدرآباد کے اردو روزناموں کی ادبی خدمات	92.00	23.00
27.	ابتدائی علم شہریت	47.00	12.00
28.	انسانی ارتقا	70.00	18.00
29.	انتظامی قانون کے اصول	120.00	30.00
30.	جامع انگریزی اردو ڈکشنری (جلد ـ 6-1)	3400.00	850.00

.31	جامع اردو انسائیکلو پیڈیا (جلد۔4-1 اور 8-6)	1790.00	448.00
.32	جنت سنگار	180.00	45.00
.33	کلیات پریم چند (جلد 1 تا 24)	4071	1018.00
.34	للو لال جی ایک ادبی سوانح	72.00	18.00
.35	لغت ابجد شاری (جلد۔1، حصہ اوّل و دوم) لغت ابجد شاری (جلد۔2، حصہ اوّل و دوم)	472.00	118.00
.36	مجموعۂ نغز	268.00	67.00
.37	مسدود راہیں	126.00	32.00
.38	مثنوی بہرام وگل اندام	66.00	17.00
.39	مولیئر	57.00	14.00
.40	مسلم ہندوستان کا زراعتی نظام	92.00	23.00
.41	اڑیسہ میں اردو	157.00	39.00
.42	پشکن	60.00	15.00
.43	قدیم ہندی فلسفہ	82.00	21.00
.44	قدیم ہندوستان میں شُودر	82.00	21.00
.45	قومی زبان	76.00	19.00
.46	قواعد کیٹیلاگ سازی	268.00	67.00
.47	صنعتی تنظیم اور انتظام	149.00	37.00
.48	سیرِ کہسار	167.00	42.00
.49	طبیعیات کے بنیادی تصورات	82.00	21.00
.50	تمل ناڈو میں اردو	135.00	34.00
.51	تنقید عقل محض	158.00	40.00
.52	تاریخ طبعی (جلد۔1)	43.00	11.00
.53	تاریخ فلسفہ سیاسیات	97.00	24.00
.54	تشریح تصاویر	66.00	17.00
.55	توضیحی لسانیات	136.00	34.00
.56	تذکرہ مخطوطات (جلد۔5-1)	431.00	108.00
.57	تالستائے	46.00	11.00
.58	اصول معاشیات	47.00	12.00
.59	اتر پردیش کے لوک گیت	120.00	30.00
.60	وجے نگر کے عہد میں نظام حکومت	118.00	30.00
.61	وادیٔ سندھ اور اس کے بعد کی تہذیبیں	45.00	11.00
.62	وضاحتی کتابیات (جلد 1، 2-22)	2650.00	663.00
.63	زراعتی انکشافات	192.00	48.00

یہ رعایت نومبر 2006 تک دی جائے گی۔

نوٹ:۔ محصول ڈاک اور محصول مال برداری (Transportation) خریدار کے ذمہ ہوگا۔ کتابوں کی قیمت پیشگی روانہ کریں۔

فیروز عالم

علی رفاد فتیحی سے گفتگو

پروفیسر علی رفاد فتیحی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ لسانیات سے وابستہ ہیں۔ آپ کی پیدائش تین جنوری1953 کو ڈوری گنج، چھپرہ (بہار)میں ہوئی۔ آپ نے ابتدائی تعلیم چھپرہ میں ہی حاصل کی بعد ازاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور 1976 میں امتیازی حیثیت سے لسانیات میں ایم۔اے۔ کیا۔ پروفیسر فتیحی نے 1989 میں کولمبیا اسکول تھیوری پر پی ایچ۔ڈی۔ کی ڈگری حاصل کی۔آپ 1978 سے 1992 تک سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز کی علاقائی شاخوں سولن، اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر لکھنؤ اور نارتھ ریجنل لینگویجز سینٹر پٹیالہ سے بطور ریسرچ اسسٹنٹ، لکچرر اور پرنسپل (انچارج) وابستہ رہے۔ 1992 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ لسانیات میں ریڈر کے طور پر تقرر ہوا۔ آپ اکتوبر 2001 سے جولائی 2002 تک قومی اردو کونسل کے پرنسپل پبلیکیشن آفیسر اور کونیل یونیورسٹی اتھاکا، نیویارک میں 2002 سے 2004 تک وزٹنگ پروفیسر بھی رہے۔

پروفیسر علی رفاد فتیحی کی اہم تصانیف مندرجۂ ذیل ہیں۔ اسلوبیاتی تنقید (1989) ، اے گرامر آف اردو (1990)، دی لینگویج آف ایڈورٹائزنگ اینڈ ٹی۔وی۔ کمرشیل (1991) ایسپیکٹس آف عربک فونولوجی (2001) اردو ان ملٹی لنگول انڈیا، پالیٹکس آف لینگویج! اے کیس آف اردو۔ ملک اور بیرون ملک کے مختلف مقتدر رسائل میں آپ کے تحقیقی اور لسانیاتی مضامین مسلسل شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ''اردو دنیا'' میں بھی اپریل سے اکتوبر 2002 کے درمیان آپ کی تجزیاتی رپورٹ ''ہندوستان میں ریاستی سطح پر اردو آبادی کا جائزہ'' کے عنوان سے چھپی تھی جس میں ملک کی تمام ریاستوں کی اردو آبادی کا سماجی اور لسانیاتی جائزہ پیش کیا گیا تھا۔ پروفیسر علی رفاد فتیحی سے کی گئی گفتگو کے اہم اقتباسات قارئین ''اردو دنیا'' کے لیے پیش ہیں۔

سوال: آپ لسانیات کی جانب کیسے راغب ہوئے؟

جواب: زبان اور مسائل زبان سے انسان کا گہرا تعلق ہے اور وہ قدرتی طور پر لسانی مسائل پر غور کرنے لگتا ہے۔ زبان کے پھیلاؤ اور اس کے دائرۂ عمل میں میری بھی دلچسپی کچھ قدرتی اور کچھ جذباتی تھی۔ اسی دلچسپی کی بنا پر میں نے شعبۂ لسانیات میں داخلہ لیا جہاں مجھے لسانی مباحث اور دیگر متعلقہ موضوعات پر مفید، پرمغز اور فکر انگیز تحریریں پڑھنے کا موقع ملا۔

سوال: لسانیات کے کس شعبے سے آپ کا تعلق ہے؟

جواب: لسانیات کے ایک طالب علم کی حیثیت سے یوں تو میرا تعلق لسانیات کے مختلف شعبوں سے ہے۔ لیکن میری خاص دلچسپی کا موضوع لسانی تنازعہ اور لسانی کشمکش ہے۔ لسانی کشمکش اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کوئی زبان کسی اہم زبان کو زیر کرنا یا اس کی جگہ لینا چاہتی ہے۔ یہ لسانی کشمکش آہستہ آہستہ لسانی اضطراب میں بدل جاتی ہے۔ جھارکھنڈ کی قبائلی زبانوں پر میرے ایک تحقیقی مطالعے میں لسانی اضطراب کی یہ کیفیت واضح طور پر نظر آئی۔

سوال: اردو کے آغاز و ارتقا کے سلسلے میں کئی نظریات پیش کیے گئے ہیں آپ کس نظریے کو سب سے بہتر سمجھتے ہیں اور کیوں؟

جواب: اردو ایک جدید ہند آریائی زبان ہے جس کی داغ بیل ہندوستان کی دیگر جدید ہند آریائی زبانوں کی طرح ہزار سنہ عیسوی کے بعد پڑی ہے۔ اردو زبان کے آغاز و ارتقا کے متعلق ایسے ایسے نظریات پیش کیے گئے ہیں کہ یہ موضوع نہایت پیچیدہ اور حوصلہ شکن بن گیا ہے۔ محققین نے ایسے ایسے حقائق کا انکشاف کیا ہے کہ یہ حقائق ناقابل فہم بن گئے ہیں۔ بہر کیف پروفیسر مسعود حسین خاں کا نظریہ ان تمام نظریات میں سب سے زیادہ مستند اور معتبر نظر آتا ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ لسانی تبدیلیاں نہایت خاموشی سے رونما ہوتی ہیں لہٰذا زبانوں کے آغاز وارتقا سے متعلق اظہار خیال نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے۔ محمود شیرانی نے اپنی کتاب میں جو دلائل پیش کیے ہیں اسے صاف طور پر خارج بھی نہیں کیا جا سکتا۔

سوال: اردو رسم الخط کی بنیادی خوبیاں کیا ہیں؟

جواب: رسم الخط انسانی آوازوں کی تحریری علامت ہوتا ہے چونکہ تحریری علامتیں خود آواز نہیں ہوتیں بلکہ ان کا صرف صوتی اظہار ہوتی ہیں لہٰذا بالعموم اصوات وحروف کا کوئی منطقی یا صوری تعلق نہیں ہوتا بلکہ

استعمال عام سے ان میں خارجی تطبیق پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اردو رسم الخط میں اصوات کی بعض نمایاں خصوصیات کے اعتبار سے ہی ان کی تحریری علامتیں مقرر کی گئی ہیں۔ مثلاً طویل مصوتہ " آ"(a:) کے لیے "الف" کا استعمال یا مدوّر طویل مصوتے " او"(o:) یا "اُو"(u:) کے لیے حرف "و" کا استعمال ان مشابہتوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ اس کا اطلاق معدودے چند حروف پر ہی ہو سکتا ہے۔ یہ اردو رسم الخط کی ایک ایسی بنیادی خوبی ہے جو کسی دوسرے رسم الخط میں نہیں ملتی۔ اردو رسم الخط کی ایک دوسری اہم خوبی اختصار ہے۔ حروف کی ذیلی شکلوں کی وجہ سے طویل عبارتیں بھی کم سے کم جگہ میں لکھی جا سکتی ہیں اور ان کے پڑھنے میں بھی نسبتاً کم وقت لگتا ہے۔

سوال: رسم الخط کسی بھی زبان کا لباس ہی نہیں روح بھی ہے۔ جبکہ بعض ماہرین لسانیات رسم الخط کو زبان کا لازمی جزو تسلیم نہیں کرتے۔ آپ کا اس سلسلے میں کیا نظریہ ہے خصوصاً اردو کے حوالے سے؟

جواب: آپ کا خیال درست ہے۔ زبان اور رسم الخط کا یوں تو کوئی منطقی تعلق نہیں ہوتا لیکن استعمال عام کی وجہ سے ان میں ایک ربط پیدا ہو جاتا ہے جو نسل در نسل منتقل ہوتا رہتا ہے اور اہل زبان اس ربط سے اس قدر مانوس ہو جاتے ہیں کہ اس سے ایک جذباتی لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر معاشرے کی نفسیاتی اور ذہنی تبدیلیاں رسم الخط پر اثر انداز ہوتی ہیں اور رسم الخط کی حیثیت متعین ہوتی ہے۔ لہٰذا میرا خیال ہے کہ رسم الخط کی تبدیلی اردو کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔

سوال: بول چال کی سطح پر یوں تو اردو کو فروغ حاصل ہو رہا ہے لیکن تلفظ کا معیار خراب ہو رہا ہے۔ اس مسئلے کا کیا حل ہے؟

جواب: یوں تو اردو کے مسائل بے شمار ہیں لیکن اردو کے بنیادی مسائل میں سب سے اہم مسئلہ اس کے رسم الخط کے تحفظ اور فروغ کا ہے۔ اس زبان کی ادبی و ثقافتی روایتوں کو باقی رکھنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ اردو رسم الخط کے فروغ کے لیے کوئی ٹھوس اور مشترکہ لائحہ عمل طے کیا جائے تاکہ ملک گیر سطح پر اردو برادری اس پر عمل پیرا ہو سکے۔

جہاں تک تلفظ کے معیار کا سوال ہے تو اس کی ایک وجہ یقینی طور پر اردو رسم الخط کے چلن میں کمی ہے۔ ہم اردو والوں نے اجتماعی سطح پر کوئی عملی تحریک شروع نہیں کی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک عملی تحریک کا آغاز کیا جائے۔

سوال: اردو رسم الخط کو بہتر طور پر سکھانے اور بہتر تلفظ کی تربیت کے لیے کون سے طریقے اپنائے جا سکتے ہیں؟

جواب: احباب اردو آج بھی مشاعرے، تقریبات، اعزازات اور انعامات میں اس حد تک مصروف ہیں کہ تعمیری اور عملی تجاویز کو ہمیشہ نظر انداز کرتے ہیں۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو رسم الخط کے تحفظ کے لیے ایک مشترکہ لائحہ عمل تیار کیا جائے۔ نئے تناظر اور تقاضوں کے تحت اردو حروف تہجی کی معیار بندی سب سے اہم کام ہے۔ اسی طرح تلفظ کی معیار بندی کے لیے ضروری ہے کہ اردو کے ماہرین لسانیات مل کر ایک معیاری صوتی قاعدہ (Phonetic Reader) تیار کریں۔ ادب اطفال کی معیار بندی سے بھی ان مسائل کو حل کیا جا سکتا ہے۔

سوال: اردو کے فروغ کے لیے کیا اقدامات کیے جانے چاہئیں؟

جواب: زیادہ تر باتوں کا تو ذکر پہلے آ چکا ہے۔ اردو کے فروغ میں بچوں کا ادب نمایاں کردار ادا کر سکتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ بچوں کے ادب کی معیار بندی کی جائے۔ اسی طرح مقبول ادب (Popular Literature) کی طرف بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ مقبول ادب کی کتابیں زیادہ سے زیادہ اور دیدہ زیب طباعت میں منظر عام پر آئیں تو اردو کی طرف لوگوں کی دلچسپی یقیناً بڑھے گی۔

سوال: آپ نے ابھی ادب اطفال کا ذکر کیا۔ اس ضمن میں تدریس کے جو مسائل ہیں۔ خاص طور سے اردو زبان اور ادب کی تدریس کے اس حوالے سے آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: زبان بظاہر محض ایک ذریعۂ اظہار ہے مگر فی الواقع زبان ذریعۂ اظہار ہونے کے ساتھ ساتھ کسی لسانی طبقے کی روایات، اخلاقی اقدار اور تہذیب و ثقافت کی آئینہ دار بھی ہوتی ہے۔ لہٰذا تدریس کی زبان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس متعلقہ لسانی طبقے کی روایت و ثقافت کی امین بھی ہو۔ اگر کوئی تدریسی منصوبہ بندی ان خصوصیات کی حامل نہیں ہے تو وہ کسی بھی طرح کامیاب طریقۂ تدریس کا درجہ حاصل کرنے کی اہل نہیں ہے۔ جب اس معیار پر ہم اردو زبان و ادب کے تدریسی اصولوں کو پرکھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ اردو تدریس کی منصوبہ بندی میں تبدیلیوں کی بہت گنجائش ہے۔ اس بحث سے قطع نظر کہ اردو کا تعلق کس مذہبی گروہ سے ہے۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ پچھلی دو دہائیوں میں اردو زبان کی سماجیات میں نمایاں تبدیلی آئی ہے۔ آج بھی ایک عام خیال یہ ہے کہ اردو شہری اعلیٰ طبقے (Urban elite) کی زبان ہے لیکن بدلے ہوئے حالات کے زیر اثر اردو نے دیہی علاقوں میں بھی اپنی جڑیں مضبوط

کی ہیں۔ لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ آج اردو دیہی علاقے کے اردو داں طبقے کی پروردہ زبان ہے۔ اردو کی اس نئی سماجیات کے پیش نظر ضرورت اس بات کی ہے کہ ان زمینی حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے اردو تدریس کی نئی منصوبہ بندی کی جائے تاکہ طریقۂ تدریس کو دیہی علاقے کی تہذیبی اور ثقافتی روایات کا آئینہ دار بنایا جاسکے۔ ابتدائی درجات میں اردو ادب کی تدریس پر بھی یہ بات صادق آتی ہے۔ مثال کے طور پر غالب اور اقبال کی بہ نسبت نظیر اکبرآبادی کی شاعری دیہی علاقے کی روایات سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔ لہٰذا توقع کی جاتی ہے کہ نظیر کا شعری آہنگ مبتدی کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگا۔

سوال: ہندی والے برج، میتھلی، اودھی اور بھوجپوری وغیرہ تمام بولیوں کو ہندی کی بولیاں یا اُس کی ذیلی شاخیں قرار دیتے ہیں۔ ان بولیوں پر اردو کے بھی کافی اثرات ہیں۔ کیا انھیں اردو کی بولیاں قرار دیا جاسکتا ہے؟

جواب: یقیناً۔ اردو زبان کے دائرے کو وسیع کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان بولیوں کو اردو کے دائرے میں شامل کیا جائے۔ یہ ہماری بدقسمتی رہی ہے کہ ہم نے علاقائی بولیوں سے اپنے رشتے کو مستحکم نہیں کیا ہے جس کی وجہ سے ہم نے انشاء اللہ خاں کی تصنیف ''رانی کیتکی کی کہانی'' کو نہیں اپنانے کی غلطی کی۔ جب بھی علاقائی زبانوں اور اردو کے رشتے کا سوال پیدا ہوتا ہے تو اہل اردو عموماً اردو کا تاریخی کردار فراموش کردیتے ہیں اور معیاری زبان کے تصوّر کو اپنے مباحث میں شامل کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ''معیار بندی'' کا تصوّر ایک محدود تصوّر ہے۔ بعض اوقات علاقائی زبانوں کے ذخیرۂ الفاظ میں ایسے رویوں کو بیان کرنے والے الفاظ دکھائی دیتے ہیں جو انسان کو ایک تیز رفتار اور بدلتی ہوئی دنیا سے آشنا کرتے ہوں۔ اگر اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو محسوس ہوگا کہ علاقائی زبانیں اپنے فکری ذخائر اور اپنے زمینی تجربے کے باعث اردو کی آبیاری کے لیے نہایت ضروری ہیں۔

سوال: آج گلوبلائیزیشن اور لبرلائیزیشن کے دور میں بول چال کی سطح پر ہر زبان، خصوصاً اردو اور ہندی میں نمایاں تبدیلیاں آرہی ہیں۔ اور اردو، ہندی، انگریزی لفظیات کے ذریعے ایک نئی لنگوا فرینکا معرضِ وجود میں آرہی ہے۔ کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ ادبی سطح پر بھی ان زبانوں میں تبدیلیاں رونما ہوں گی؟

جواب: ہر زبان اپنے ارتقا کے دوران وقت اور مقام کے ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ زبان میں یہ تبدیلیاں یک لخت رونما نہیں ہوتیں بلکہ غیر محسوس طریقے سے بتدریج وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ بالفاظ دیگر ہر زبان کا ایک لسانی تناظر ہوتا ہے جس پر دوسری زبانوں سے اخذ واکتساب کی داستانیں رقم ہوتی ہیں۔ ہندی اور اردو کے تناظر میں بھی یہ بات صادق آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہندی اردو کی نئی آواز لسانی تکثیریت اور مقبول عام لب ولہجے کی آواز ہے۔ ہندی اور اردو ادب کے بعض اہم تخلیق کاروں نے فرسودہ لسانی ڈھانچے کی ردِّ تشکیل کر کے ادب کی زبان کو نئے لسانی مزاج سے ہم آہنگ کیا ہے۔

سوال: اردو اور ہندی کو قریب لانے کے لیے کیا اقدامات کیے جانے چاہئیں؟

جواب: ایسی کوششیں دونوں زبانوں کے لیے سودمند ثابت ہوں گی۔ آج ہندوستانی معاشرے میں لسانی رویّوں کی equation بدل گئی ہے لہٰذا لسانی اظہار کے نئے امکانات تلاش کرنا ہماری مجبوری ہے۔ ہندی اخبارات نے جس طرح اردو الفاظ کا استعمال شروع کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لسانی اظہار کے نئے امکانات تلاش کیے جارہے ہیں۔ ان بدلے ہوئے حالات میں سماجی لسانیات کے ماہرین کو سماجی تبدیلیوں کے مطالعے کے لیے موثر طریقۂ کار ڈھونڈنے ہوں گے اور اپنا پرانا راگ کہ اردو ہندی ایک زبان ہے کو ختم کرنا ہوگا۔

سوال: گریرسن نے مغربی ہندی اور مشرقی ہندی کا جو تصور پیش کیا ہے بعض ماہرین لسانیات اسے غیر سائنٹفک قرار دیتے ہیں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: جدید ہند آریائی زبانوں کی گروہ بندی میں بہت سے اختلافات ہیں۔ گریرسن سے بہت پہلے 1880 میں ہارنلے (Hoernle) نے پہلی بار یہ نظریہ پیش کیا کہ ہندوستان میں آریہ دو گروہوں میں آئے اور اس طرح آریائی زبانوں کے دو گروہ ''بیرونی'' اور ''اندرونی'' ہیں۔ ان گروہوں میں ''بیرونی گروہ' قدیم ترین اور ''اندرونی گروہ' مابعد کا ہے۔ گریرسن نے ہارنلے (Hoernle) کے اس نظریے کو کچھ ترمیم کے ساتھ پیش کیا۔ مثلاً گریرسن نے ''اندرونی'' اور ''بیرونی'' گروہ میں ''درمیانی'' گروہ کا اضافہ کیا۔ البتہ ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی نے اس تقسیم کی زوردار تردید پیش کی۔

مغربی ہندی اور مشرقی ہندی گریرسن کے دیے ہوئے نام ہیں۔ تاریخ لسانیات کے نقطۂ نظر سے ''مغربی ہندی'' شورسینی کے خاندان سے ہے جبکہ مشرقی ہندی کا تعلق 'اردھ ماگدھی' سے ہے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ تقسیم سائنٹفک نہیں ہے۔

سوال: اسلوبیاتی تنقید کیا ہے۔ کسی متن کا اسلوبیاتی جائزہ لیتے وقت کن امور کی طرف توجہ دینی چاہیے؟

جواب: بیسویں صدی میں لسانیات کے فروغ کے ساتھ ساتھ اس کی مختلف

شاخیں بھی قایم ہوئیں جن کی بنا پر لسانیاتی نقطۂ فکر کا اطلاق مختلف مضامین کے مطالعے میں کیا جانے لگا۔ ادب کے مطالعے میں لسانیاتی نقطۂ فکر کو ''اسلوبیات'' یا ''اسلوبیاتی تنقید'' کہتے ہیں۔ مزید وضاحت کے لیے کہا جاسکتا ہے کہ ہر ادبی تخلیق کا بنیادی عنصر اظہار ہوتا ہے جو لسانی ہیئت کے وسیلے سے اپنا وجود پاتا ہے۔ تخلیقی تجربہ جب اپنی شناخت کرانے پر آمادہ ہوتا ہے تو اپنی مخصوص لازمی اور فطری لسانی صورت میں ڈھل جاتا ہے۔ اس لسانی اظہار میں ایک خوش ترتیبی اور خوش نظمی ہوتی ہے۔ اسلوبیاتی تنقید ادبی تخلیق میں خوش ترتیبی اور خوش نظمی کو ادب کا معیار مانتی ہے۔ اپنے طرز مطالعہ اور طریق کار کی نوعیت کے اعتبار سے یہ خالص تجزیاتی تنقید ہے۔

سوال: اسلوبیات کا لسانیات سے کیا رشتہ ہے؟

جواب: اسلوبیاتی تنقید کا لسانیات سے بہت گہرا رشتہ ہے کیوں کہ ''زبان'' ادب کا ذریعۂ اظہار ہے اور لسانیات کا موادِ موضوع۔ یہی وجہ ہے کہ زبان کے پر پیچ ڈھانچے کے توضیحی مطالعے میں ایک ماہر لسانیات جو معروضی نقطۂ نظر اور صریحی انداز فکر اختیار کرتا ہے وہ ادب کے تجزیے میں بھی معاون ثابت ہوتا ہے۔

ایک عام خیال یہ ہے کہ اسلوبیاتی تنقید تخلیق کے صوتی تجزیے کا نام ہے یا پھر اس کے ذریعے فن پارے میں مستعمل اسم، فعل یا صفت کی درجہ بندی کر دیتے ہیں اور ادب کی جمالیاتی قدروں کو نظر انداز کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلوبیاتی تنقید نہ صرف لسانی اصولوں کو بروئے کار لاتی ہے بلکہ ادب کی جمالیاتی قدروں کو بھی اپنی بنیاد بناتی ہے۔ اسلوبیاتی تنقید کے ذریعے تخلیق کے لسانی اور جمالیاتی خصوصیات کا بیک وقت مطالعہ پیش کیا جاسکتا ہے۔

سوال: اردو کے اہم اسلوبیاتی تنقید نگار کون ہیں؟

جواب: اردو میں اسلوبیاتی تنقید کی ابتدا پروفیسر مسعود حسین خاں کے مضامین سے ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ پروفیسر مسعود حسین خاں نے اردو میں باقاعدہ طور پر اسلوبیاتی تنقید کی بنیاد ڈالی۔ اردو کے دوسرے اہم اسلوبیاتی نقادوں میں پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر مغنی تبسم اور پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ کے نام اہم ہیں۔ ان اسلوبیاتی نقادوں نے زبان اور اس کے اظہار کی گوناگوں صورتوں کے تجزیاتی مطالعے کی جانب باقاعدہ توجہ کی۔ ہر تخلیقی تجربے کی تعمیر، لسانی ساخت کی ایک نئی ترتیب پر منحصر ہوتی ہے اور اظہار کی ایک نئی ہیئت اس ترتیب سے وجود میں آتی ہے۔ لسانی ہیئت کی معنی خیزی ہمیشہ تجربے کی معنی خیزی سے مربوط ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلوبیاتی نقاد لسانی ہیئت اور تجربوں کی معنی خیزی کو معیار کے مطابق سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس سلسلے میں راقم الحروف کی کتاب ''اسلوبیاتی تنقید'' کا ذکر بھی بے جا نہ ہوگا۔ اس کتاب میں اسلوبیاتی تنقید کے ارتقا اور اس کے طریقۂ کار سے تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

سوال: چونکہ آپ نے امریکہ میں بھی کافی عرصے تک تدریس کے فرائض انجام دیے ہیں، اس حوالے سے آپ کے کیا تجربات رہے؟

جواب: کچھ عرصے کے لیے میں امریکہ آئی.وی.لیگ یونیورسٹی میں درس و تدریس میں مشغول رہا۔ یہ تجربہ نہایت دلچسپ تھا۔ غیر ممالک میں اردو زبان و ادب کی تدریس بالعموم ثانوی زبان کی حیثیت سے ہوتی ہے۔ لیکن امریکی یونیورسٹیوں میں زبانوں کی تدریس ثانوی زبان کے ساتھ ساتھ لسانی ورثے کی زبان (Heritage Language) کی حیثیت سے بھی ہوتی ہے۔ لسانی ورثے کی زبان کی حیثیت سے کسی زبان کا تدریسی طریقۂ کار قطعی مختلف ہوتا ہے۔ لسانی ورثے کی حیثیت سے تدریس زبان کا مقصد مہاجر برادری (Diasporic Community) کے آداب و اخلاق، اطوار و اسالیب، طرز کلام اور رہن سہن کے طور طریقوں کو نئی نسل تک پہنچانا ہوتا ہے۔ مثلاً آداب و القاب اور حفظ مراتب سے متعلق اردو زبان میں الفاظ کا جتنا بڑا ذخیرہ ہے وہ یقیناً انگریزی میں نہیں ہے۔ لہٰذا لسانی ورثے کی زبان کے نصاب میں ان امور پر خاص توجہ دی جاتی ہے جس کی وجہ سے ان کے نصاب میں ثقافت کے گہرے اثرات موجود ہوتے ہیں۔

سوال: قومی اردو کونسل نے اردو زبان و ادب اور تعلیم کے فروغ کے لیے جو کوششیں کی ہیں ان کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: میرا خیال ہے کہ اپنے قیام کے بعد اس ادارے نے پورے خلوص کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیے ہیں اور اس کے قیام نے اردو آبادی کو امید کی نئی روشنی دی ہے۔ اس ادارے نے اردو زبان کو جدید ٹکنالوجیکل منظر نامے سے جوڑنے کا جو کام کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ پچھلے کچھ عرصے میں قومی اردو کونسل ایک ایسے ادارے کے طور پر ابھر کر سامنے آئی جس کا مقصد اردو کو معاصر تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا ہے۔ اپنے مقاصد کے تحت ''اردو دنیا'' نے اردو کے نفاذ سے دلچسپی رکھنے اور اس کے لیے تدابیر اختیار کرنے والوں کے درمیان رابطے کا ایک مفید کام انجام دیا ہے۔

سوال: ''اردو دنیا'' کے قارئین کے نام آپ کیا پیغام دیں گے؟

جواب: قارئین سے میری گزارش ہے کہ اردو سے جذباتی رشتہ قایم کریں اور نئی نسل کو اردو ضرور پڑھائیں اور سکھائیں۔

□□□

اعجاز مسیح

چند غیر روایتی تدریسی طریقے

ایک اچھا استاد ہمیشہ اس بات کے لیے کوشاں رہتا ہے کہ تدریس کے دوران ایسی حکمت عملی اپنائی جائے کہ زیادہ سے زیادہ طلبہ کی بہتر سے بہتر آموزش ہو سکے۔ دوسرے لفظوں میں تدریس کا مقصد تعلیمی مقاصد کا حصول ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ تدریس کا عمل ایک پیچیدہ عمل ہے۔ کوئی ایک طریقہ تدریس ہر صورت میں موثر نہیں ہو سکتا۔ بلکہ طلبہ کی ضرورتوں، ان کی دلچسپی، ان کے ذہنی معیار اور عمر کے لحاظ سے کوئی بھی طریقۂ تدریس مناسب یا نا مناسب ہے۔ اسی طرح مضمون کے مواد کی فطرت بھی کسی خاص طریقۂ تدریس کی متقاضی ہوتی ہے۔ ماہرین تعلیم الگ الگ حالات میں تدریس کے مختلف طریقوں کو تحقیق کے ذریعے آنکنے کی لگاتار کوشش کرتے رہتے ہیں۔ درس و تدریس کے میدان میں کی گئی تحقیق کے نتیجے میں کئی غیر روایتی تدریسی طریقے دریافت ہوئے ہیں اور یہ بھی پایا گیا کہ ان میں سے ہر ایک طریقۂ تدریس خاص حالات میں روایتی طریقۂ تدریس کے مقابلے میں اپنے مقصد کے حصول میں زیادہ کامیاب رہا ہے۔ کسی بھی استاد کے لیے ان غیر روایتی تدریسی طریقوں کی جانکاری، ان کی امتیازی خصوصیات و حدود اور ان کے مراحل (اجزا) کی واقفیت اسے اپنی تدریس کو بہتر بنانے کے لیے لازم ہے کیونکہ ضرورت کے لحاظ سے نہ صرف وہ ان تدریس کے طریقوں کو اپنا سکتا ہے بلکہ ان حالات میں ضرورت کے مطابق تبدیلی بھی کر سکتا ہے یا پھر ان کا کچھ حصہ اپنا سکتا ہے۔ اس باب میں ایسے چار غیر روایتی تدریس کے طریقوں پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ تدریس کے یہ طریقے درج ذیل ہیں۔

1. امداد باہمی کے ذریعے آموزش (Cooperative Learning)
2. تمثیلی کھیل (Simulation Games)
3. ماہرانہ آموزش (Mastery Learning)
4. ٹیم تدریس (Team Teaching)

امداد باہمی کے ذریعے آموزش

آموزش بذریعہ امداد باہمی کی اہمیت سے آج شاید ہی کوئی استاد انکار کر سکتا ہے۔ آموزش بذریعہ امداد باہمی کا صحیح تصور ذہن نشیں کرنے کے لیے تین اصطلاحات کے معنی اور ان کا فرق سمجھ لینا ضروری ہے۔ یہ اصطلاحات ہیں: (1) باہمی تعاون کرنا سیکھنا (Learning to Co-operate) (2) آموزش کے لیے امداد باہمی (Cooperate to Learn) اور (3) باہمی تعاون کے ساتھ کام کرنا سیکھنا (Learning to Work Cooperatively)۔ کسی دوسرے شخص کا کام کرنے یا مسئلے کا حل کرنے میں مدد و تعاون کرنے کی صلاحیت اگر آپ نے پیدا کر لی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ نے باہمی تعاون کرنے کی مہارت سیکھ لی ہے۔ اس کے برخلاف آموزش کے لیے امداد باہمی کے عمل کا مطلب یہ ہے کہ مختلف طلبہ آپس میں اس طرح تعاون و اشتراک کریں کہ اس کے نتیجے میں سبھی کی آموزش ہو پائے اور خود کے ساتھ ساتھ دوسروں کی آموزش کے لیے بھی ہر شخص ایک دوسرے کا معاون ہو۔ جہاں تک تیسری اصطلاح کا تعلق ہے اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ کسی بھی گروپ میں ساتھ کام کرنے والوں کے اندر یہ صلاحیت اور جذبہ پیدا کیا جائے یا ان میں اس کی آموزش ہو جائے کہ وہ گروپ کے ہدف کو حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون و اشتراک کریں۔ مگر ساتھ کام کرنے کی استعداد کی آموزش کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لازماً طلبہ ایک دوسرے کی معاونت اس طرح کر پائیں گے کہ ہر طالب علم کی آموزش اس حد تک ہو جائے جتنا اسے ہونا چاہیے تھا۔

آموزش بذریعہ امداد باہمی کے لیے مندرجۂ بالا تینوں باتوں کا ہونا ضروری ہے۔ عام طور پر یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ طلبہ درجے میں اگر ایک ساتھ گروپ میں کام کر رہے ہیں تو یہی آموزش بذریعہ امداد باہمی کا عمل ہے۔ مگر محض ایک ساتھ کام کرنا آموزش بذریعہ امداد باہمی کی پہلی شرط ہے۔ اس کے علاوہ تمام طلبہ کا عملی طور پر ایک دوسرے سے تعاون کرنا اس لیے ضروری ہے کہ گروپ کے لیے جو ہدف متعین کیا گیا ہے وہ حاصل ہو جائے۔ یہ آموزش بذریعہ امداد باہمی کی دوسری شرط ہے۔ اور آخری بات یہ ہے کہ باہمی اشتراک و تعاون کا یہ عمل اس وقت تک جاری رہنا چاہیے جب تک کہ گروپ میں موجود ہر طالب علم کی آموزش طے کیے ہوئے نشانے تک نہ پہنچ جائے۔ اس طرح آموزش بذریعہ امداد باہمی کے لیے لازم ہے کہ درجے میں موجود طلبہ کو مختلف ٹولیوں (گروپ) میں منقسم کیا جائے۔ پھر ہر گروپ کو اپنے ہدف

نوٹ: یہ مضمون ڈاکٹر محمد اختر صدیقی کی مرتب کردہ کتاب "تدریس — آموزشی حکمت عملیاں" سے ماخوذ ہے۔ اس میں تدریس اور آموزش کے لیے دستیاب مختلف النوع حکمت عملیوں، مہارتوں اور وسائل پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی نے شائع کی ہے۔

کے حصول کے لیے مل کر کام کرنے کے مواقع فراہم کیے جائیں اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ گروپ کے ممبران کا آپسی تعاون و اشتراک محض گروپ کے ہدف کے حصول تک محدود نہ ہو کر ہر ممبر کی آموزش پر مرکوز ہو اور اس کے لیے مشترکہ غور وخوض، بحث و مباحثہ اور مسئلے کا مشترکہ تجزیہ اور ان سب کے نتیجے میں مسئلے کا اتفاق رائے سے حل تلاش کرنے کی کوشش کی جائے اور ان سب اقدامات کے دوران کسی بھی ممبر کو پیش آنے والی دشواریوں کو مل جل کر دور کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ گروپ کے ہر ممبر کی نہ صرف خود کی دیے گئے مواد سے متعلق ادراکی، تاثراتی اور حرکی سطح پر آموزش ہو جائے بلکہ دوسرے ممبران کی آموزش کا حصول بھی یقینی بن جائے۔

دوسرے لفظوں میں آموزش بذریعہ امداد باہمی گروہی آموزش کا وہ عمل ہے جس میں گروپ کی ساخت اور اس گروپ کے کام (Group Task) کا تعین زیادہ باضابطہ انداز میں کیا جاتا ہے اور گروپ میں شامل تمام طلبہ باہمی تعاون و اشتراک سے نہ صرف اپنے گروپ کے لیے متعین ہدف کے حصول کے لیے عملی سعی کرتے ہیں بلکہ یہ ایک دوسرے کا تعاون کرکے، ہر ممبر کی مہارت کی حد تک، آموزش کو یقینی بناتے ہیں۔

آموزش بذریعہ امداد باہمی کی مندرجۂ ذیل خصوصیات اسے کسی بھی دوسرے طریقۂ تدریس سے ممتاز کرتی ہیں۔

(1) اس طریقے میں روایتی طریقۂ تدریس کے مقابلے میں آموزش کے لیے داخلی محرکہ (Intrinsic Motivation) زیادہ کارفرما ہوتا ہے۔
(2) تنقیدی استدلال کی صلاحیت اور کام میں اسے اپنانے کی مہارت پیدا کرنے میں زیادہ معاون ہوتا ہے۔
(3) سبھی طلبہ کو بغیر رکاوٹ کے انفرادی طور پر اور بہ طور گروپ ممبر باہمی تعاون کے ماحول میں آموزش کے مواقع فراہم کرتا ہے۔
(4) آموزش کو مہارت کی حد تک حاصل کرنے کے لیے سبھی طلبہ کو زیادہ فطری مواقع فراہم کرتا ہے۔
(5) متفقہ و مشترک مقصد کے حصول کے لیے گروپ کے سبھی طلبہ کو اشتراک و تعاون کے ماحول میں ایک ساتھ کام کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔
(6) طلبہ میں دوسروں کے ساتھ کام کرنے کے لیے درکار مثبت رویہ پیدا کرتا ہے۔
(7) طلبہ میں استاد، مضمون اور اسکول کے لیے بھی مثبت رویہ پیدا کرنے میں معاون ہوتا ہے۔ آموزش بذریعہ امداد باہمی کا طریقہ استعمال کرنے کے لیے کسی استاد کو مندرجۂ ذیل مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔

(1) گروپ کے لیے کام (ہدف) اور مضامین سے متعلق آموزشی مقاصد کا واضح تعین۔
(2) گروپ کی تشکیل۔
(3) گروپ کو واضح ہدایت دینا۔
(4) گروپ کو کام کرنے کے مواقع فراہم کرنا اور اس کے صحیح سمت میں آگے بڑھنے کو یقینی بنانا۔
(5) امداد باہمی کے ذریعے آموزشی مقاصد تمام طلبہ کے لیے قابل حصول بنانا۔

تمثیلی کھیل

کھیل کے مواقع ملنا ہر بچے کا فطری حق ہے۔ کھیل اور نقل نہ صرف بچوں کی بلکہ بڑوں کی بھی ذاتی جھجک اور رکاوٹوں کو دور کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ آج ماہرین نفسیات اور تعلیم کا اس بات پر تقریباً اتفاق ہے کہ کھیل کود پر مبنی طریقۂ تعلیم زیادہ دور رس اور پُر معنی آموزش کا ذریعہ ہوتا ہے۔ Carl Seashore نے اپنی کتاب Psychology in Daily Life میں کھیل کی اہمیت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے: ''کھیل نشوونما کا بہترین ذریعہ ہے۔ یہ نتیجہ اخذ کرنا موزوں ہوگا کہ بغیر کھیل کود کے کسی بالغ شخص کی نارمل وقوفی زندگی (Cognitive Life) ممکن نہیں ہے اور بغیر کھیل کے قوت ارادہ کی صحت مند نشوونما بھی نہیں ہوسکتی۔ لیکن کھیل کو محض انسانی نشوونما کا ذریعہ ہی نہیں ہے بلکہ آج ماہرین نفسیات اور ماہرین تعلیم کے درمیان اس بات پر تقریباً اتفاق ہے کہ کھیل کود پر مبنی طریقۂ تعلیم دور رس اور بامعنی آموزش کا بہترین ذریعہ بن سکتا ہے۔

رسمی تعلیم کا مقصد مختلف فطری اور سماجی مظاہر اور حقیقتوں کا علم مختلف مضامین کے توسط سے درجہ میں موجود طلبہ کو مہیا کرنا ہوتا ہے۔ مگر ان مظاہر و عوامل کا براہ راست مشاہدہ طلبہ کو کروانا ہمیشہ ممکن نہیں ہوتا۔ مثلاً اگر آپ ہندوستانی پارلیمنٹ کی ساخت یا طریقۂ کار کے بارے میں اپنے طلبہ کو بتانا چاہتے ہیں تو درجہ کے اندر ہندوستانی پارلیمنٹ کو نہیں لایا جاسکتا یا اگر نقل و حمل کے مختلف وسائل کے متعلق طلبہ کو بتانا ہے تو ان وسائل کو درجہ میں لانا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے اگر کوئی ایسا کھیل درجہ میں کھیلا جاسکے جس میں ان حقیقی چیزوں کی نقل کا عنصر شامل ہو تو ایسے کھیل کو تمثیلی کھیل (Simulation Game) کہا جاتا ہے۔ اور اس کھیل کی مدد سے طلبہ کو نہ صرف اس چیز کے متعلق معلومات فراہم کی جائے گی بلکہ اس کی آموزش زیادہ دیرپا اور فطری بھی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ آج تمثیلی کھیل کو ایک طریقۂ تدریس کے طور پر اپنانے کی مختلف حلقوں کی جانب سے زبردست وکالت کی جارہی ہے۔

تمثیلی کھیل کے طریقے کو بحیثیت تدریس اپنانے کے لیے کھیل اور تمثیلی کھیل کا مطلب سمجھنا ضروری ہے۔

کھیل ایک ایسی سرگرمی ہے جو کھلاڑی یا کھلاڑیوں کے ذریعے کی جاتی ہے اور کھلاڑی کا ہر عمل کسی واضح ضابطے کا پابند ہوتا ہے جو اس خاص کھیل کے لیے وضع کیا گیا ہو اور اس عمل کا نشانہ، ہدف کا حصول ہوتا ہے۔

تمثیلی کھیل کسی بھی عام کھیل سے صرف اس طرح مختلف ہے کہ تمثیلی کھیل کے عناصر کسی خارجی حقیقت کی کسی حد تک صحیح نمائندگی کرتے ہیں یا اس کے ماڈل یا نمونہ ہوتے ہیں۔ اور کھیل کے دوران کھلاڑی ان سے اسی طرح تفاعل کرتا ہے جیسا کہ اسے حقیقی صورت حال میں کرنا ہوتا ہے۔ گویا تمثیلی کھیل کے لیے ضروری ہے کہ اس میں مندرجۂ ذیل خصوصیات موجود ہوں۔

1. شرکائے کھیل سرگرم عمل ہوں۔
2. شرکا کا عمل وضع شدہ ضابطے کا پابند ہو۔
3. کھیل کا ہدف متعین ہو۔
4. کھیل کے اجزائے ترکیبی ایسے ہوں کہ وہ کسی خارجی حقیقت کی نمائندگی یا نقل پیش کرتے ہوں۔

تمثیلی کھیل کو طریقۂ تدریس کے طور پر اپنانے کے مندرجۂ ذیل فائدے ہیں:

1. یہ طریقہ طلبہ کے لیے دلچسپ اور سرگرمی میں ان کی شرکت کا ضامن ہوتا ہے۔
2. یہ طریقہ بچوں کی فطرت کے مطابق ہے۔
3. اس طریقۂ تدریس میں معینہ مدت میں ہدف تک پہنچا جا سکتا ہے۔
4. فطری اور سماجی مظاہر اور حقائق کا علم بغیر کسی خطرے اور جوکھم کے حاصل کیا جا سکتا ہے۔
5. اس طریقۂ تدریس کے ذریعے طلبہ کو نہ صرف مضامین کا وقوفی علم فراہم کیا جا سکتا ہے بلکہ طلبہ میں ساتھ کام کرنے کا جذبہ اور صحت مند مقابلہ کی عادت جیسی صلاحیتیں بھی پیدا کی جا سکتی ہیں۔
6. صحیح وقت پر صحیح فیصلہ لینے کی صلاحیت بھی اس طریقۂ تدریس کے ذریعہ پیدا کی جا سکتی ہے۔ البتہ اس طریقۂ تدریس کو اپنانے کے لیے استاد کو زیادہ فعال اور تخلیقی قوت کا مالک ہونا ضروری ہے۔ استاد میں اچھی تنظیمی صلاحیت ہونا بھی اس طریقۂ تدریس کے لیے ضروری ہے۔

یہ طریقۂ تدریس ایسی جماعت میں بھی اپنایا جا سکتا ہے جہاں طلبہ کی تعداد بہت زیادہ نہ ہو۔ اکثر کھیل سے پہلے اس کی تیاری کے لیے طلبہ اور استاد دونوں کو ہی الگ سے وقت دینا ہوتا ہے۔

تمثیلی کھیل کے طریقے کو بطور طریقۂ تدریس استعمال کرنے کے لیے درج ذیل نکات پر دھیان دینا ضروری ہے۔

1. کھیل کے مقصد کا واضح تعین۔
2. طلبہ کی عمر، ان کے ذہنی معیار اور درجہ میں موجود طلبہ کی تعداد کے مطابق کھیل کے مواد کی پیچیدگی اور کھیل کے لیے درکار وقت کا تعین۔
3. کھیل کھیلنے کے لیے واضح ضابطہ کا تعین۔
4. کھیل کے لیے پورا نظم کرنا اور کھلاڑیوں کو ان کا رول سمجھانا۔
5. کھیل ضابطے کے مطابق انجام تک پہنچ جائے اس کی نگرانی کرنا۔
6. کھیل کے نتائج پر درجہ کے طلبہ کے ساتھ تبادلۂ خیال کرنا اور خلاصہ تیار کروانا۔

کسی مضمون کے تحت ایک عنوان کی تدریس کے لیے تمثیلی کھیل کو طریقۂ تدریس کے طور پر اپنانے کے لیے اس عنوان کی تدریس کے مقاصد پر غور کرنا ضروری ہوتا ہے اور ان مقاصد میں محض وقوفی مقاصد ہی نہیں بلکہ تاثراتی (Effective) اور نفسیاتی دحرکی (Psychomotor) مقاصد کی نشاندہی بھی ضروری ہوتی ہے۔ اس کے بعد ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے ایسے کھیل کا منصوبہ تیار کرنا ہوتا ہے، جس کے ذریعے ان مقاصد کا حصول ممکن ہو۔

کھیل کی نشاندہی کرتے وقت اس کے لیے درکار وسائل کے علاوہ درجہ میں موجود طلبہ کی عمر، ان کا ذہنی معیار اور تعداد کو دھیان میں رکھنا ضروری ہوتا ہے کیونکہ اس کے مطابق کھیل کے مواد کی پیچیدگیاں اور اس کے لیے درکار وقت کا تعین ممکن ہے۔

مثلاً پارلیمنٹ کا طریقۂ کار درجہ آٹھ کے طلبہ کو پڑھانے کے لیے یا متوازن غذا کی اہمیت اور اس کے اجزا کو پڑھانے کے لیے زیادہ سہل کھیل تجویز کرنا ہوگا لیکن اگر اسی عنوان کو دسویں یا بارھویں جماعت میں پڑھانا ہو تو زیادہ پیچیدہ کھیل تجویز کرنا ہوگا۔ درجہ کے زیادہ سے زیادہ طلبہ و طالبات کھیل میں ایک ساتھ یا باری باری حصہ لے سکیں اس کے لیے کھیل کا منصوبہ بناتے وقت درجہ میں موجود طلبہ کی تعداد کے مطابق ہی وقت کا تعین کیا جانا چاہیے۔

اس طریقۂ تدریس کے لیے کھیل کے واضح ضابطے کا ہونا ضروری ہے۔ مثلاً مختلف شرکا کو کن کن شرائط کی پابندی کرنی ہوگی۔ کھیل شروع کیسے ہوگا وغیرہ وغیرہ۔ اگر کسی عنوان کو پڑھانے کے لیے آپ کسی بازار میں موجود کھیل کا استعمال کرنا چاہتے ہیں تو یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ اس کا ضابطہ واضح انداز میں تحریر ہو اور وہ قابل عمل بھی ہو۔ پھر آپ کو بحیثیت استاد اس کی نگرانی کرنی

ہوگی کہ ضابطے کے مطابق کھیل کی پوری تیاری ہوگئی اور کھلاڑیوں کو ان کا رول اچھی طرح معلوم ہے۔ اور پھر ضابطے کے مطابق کھیل کھلوانا ہوگا۔ اور آخر میں کھیل کے دوران جو کچھ ہوا اور مختلف کھلاڑیوں نے جس طرح سے اپنا رول ادا کیا اس پر طلبہ کے ساتھ تفصیلی مذاکرہ کیا جائے گا۔ اس طریقۂ تدریس کا یہ ایک اہم جز ہے اور اس کے نتیجہ میں ہی ان آموزشی مقاصد کا حصول ممکن ہوگا جس کے لیے تمثیلی کھیل کروایا گیا تھا۔

آموزش برائے مہارت/ ماہرانہ آموزش

عام طور پر آج ہمارے اسکولی نظام میں درجہ کے اندر استاد کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ درجہ کے اندر موجود تمام طلبہ کو گروپ میں ایک ساتھ استاد اپنی فہم کے مطابق تعلیمی ہدایت یعنی درس (Educational Instruction) دیتا ہے۔ ایک درجے میں اوسطاً چالیس سے پچاس طلبہ ہوتے ہیں۔ استاد کے ذریعے ملنے والی اس ہدایت کو کچھ طلبہ ہی مکمل طور پر سمجھ پاتے ہیں جب کہ کچھ دوسرے اس کا کچھ حصہ ہی سمجھتے ہیں۔ نتیجتاً درجے میں موجود طلبہ کے ایک گروپ ہی کی پوری آموزش ہو پاتی ہے اور باقی طلبہ کی آموزش ناقص اور نامکمل رہ جاتی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ درجے میں استاد کو مرکزی مقام دیا جانا، اور بجائے انفرادی آموزش کے سارا زور یکساں طریقۂ ہدایت پر دیا جانا ہے۔ اس طرح درجے میں طالب علم کی آموزش کا انحصار استاد کے رحم و کرم پر اور اس کے ذریعے وضع کردہ طریقۂ تدریس و ہدایت پر ہوتا ہے اور اگر اس کے نتیجے میں آموزش میں کوئی نقص رہ جاتا ہے تو اگلے تعلیمی سال میں اس میں مزید اضافے کا بھی امکان ہوتا ہے۔ کیونکہ اب یہ طالب علم کسی دوسرے استاد کے رحم و کرم پر ہوتا ہے اور اس طرح آموزش کا یہ نقص بڑھ کر ان سبھی طلبہ کے اندر احساس کمتری اور حوصلہ کی پستی کو جنم دے دیتا ہے۔ جس کے نتیجے میں طلبہ میں اس مضمون سے عدم دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ مدرسہ (اسکول) کے نظام تعلیم کی اسی خامی کو ذہن میں رکھتے ہوئے کچھ ماہرین نے یہ محسوس کیا کہ جب تک طریقۂ تدریس میں ایسی بنیادی تبدیلی نہیں لائی جائے گی جس میں استاد یا تدریس کی جگہ درجہ میں موجود سبھی طلبہ کے انفرادی آموزش کو مرکزی حیثیت حاصل ہو اور تدریس کے دوران باز افزائش (Feed back) اور اصلاح کی ایسی حکمت عملی وضع کی جائے کہ درجہ میں موجود سبھی طلبہ یا تقریباً سبھی طلبہ کی مہارت کی حد تک آموزش ممکن ہو جائے۔ اس حکمت عملی کو ماہرانہ آموزش پر مبنی حکمت عملی کہتے ہیں۔

ماہرانہ آموزش (Mastery Learning) کیا ہے؟

ماہرانہ آموزش سے مراد ایسی آموزش ہے جس کے نتیجے میں درجہ میں موجود تمام طلبہ یا تقریباً تمام طلبہ (75 فی صد سے 90 فی صد تک) کسی مضمون کے نصابی اسباق پر مبنی میزانی (Summative) جانچ میں اتنی بہتر کارکردگی کر سکیں جتنا عام طور پر صرف وہ طلبہ کر پاتے ہیں جسے ہم اس مضمون میں پورا عبور رکھنے والے تسلیم کرتے ہیں اور جن کی تعداد عام حالت میں 20 فی صد سے شاید ہی زیادہ ہوتی ہے۔

ماہرانہ آموزش کے لیے سب سے پہلے کسی بھی مضمون کے نصابی مقاصد وضع کیے جاتے ہیں اور ان مقاصد پر مبنی ایک معتبر (Reliable) میزانی جانچ (Summative Test) کی تشکیل کی جاتی ہے۔ پھر اس نمبر (Score) کا تعین کیا جاتا ہے جو ماہرانہ کارکردگی کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس نمبر (Score) کو ماہرانہ معیار (Mastery Standard) کہا جاتا ہے۔ درجہ میں موجود عام طلبہ جو میزانی جانچ میں ماہرانہ معیار کے برابر یا اس سے زیادہ نمبر (Score) حاصل کر لیتے ہیں، ماہر (Masters) کہلاتے ہیں اور ان کی آموزش ماہرانہ آموزش کہلاتی ہے۔ اس کے برخلاف وہ طلبہ جو ماہرانہ معیار سے کم نمبر (Score) حاصل کرتے ہیں غیر ماہر (Non Masters) تصور کیے جاتے ہیں۔

ماہرانہ معیار کا تعین کرنے کے لیے مختلف طریقے اپنائے جاتے ہیں مگر سب سے آسان طریقہ ایک غیر معروضی طریقہ ہے جس میں تجربہ کار ماہرین اور اساتذہ یہ طے کرتے ہیں کہ کسی مخصوص میزانی جانچ میں کون سا Score ماہرانہ معیار کی نمائندگی کرے گا۔ دوسرا طریقہ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ اس جانچ کو اس درجہ کے ان طالب علموں کو حل کرنے کو دیا جاتا ہے جو روایتی طریقے سے پڑھ رہے ہوں۔ پھر طلبہ کی اس امتحان میں کارکردگی کے لحاظ سے درجہ بندی کی جاتی ہے۔ اور وہ نمبر جو کسی بھی طالب علم کے لیے 'A' گریڈ (Grade) لانے کے لیے درکار ہوتا ہے۔ ماہرانہ معیار تصور کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور بہتر مگر پیچیدہ طریقہ ماہرانہ معیار دریافت کرنے کے لیے اپنایا جاتا ہے۔ لیکن اس کا حصول آسانی سے ممکن نہیں ہے اس لیے یہاں اس کا ذکر نہیں کیا جا رہا ہے۔

ماہرانہ آموزش کی حکمت عملی کے مراحل

ماہرانہ آموزش کے طریقے کی وضاحت کرتے وقت اگر چہ ان مراحل کا ذکر کیا گیا ہے جن سے ایک طالب علم کو گزرنا پڑتا ہے لیکن بحیثیت استاد ہمیں یہ جاننا ضروری ہے کہ جب ماہرانہ آموزش کی حکمت عملی وضع کریں تو عام طور پر مندرجہ ذیل اقدامات کا خیال رکھیں۔

1. مہارت (ماہرانہ آموزش) کے لیے منصوبہ بندی (Planning for Mastery Learning)

2. مہارت پیدا کرنے کے لیے تدریس (Teaching for Mastery)
3. مہارت کے اعتبار سے طلبہ کی درجہ بندی (Grading for Mastery)

ماہرانہ آموزش کے لیے تدریسی حکمت عملی وضع کرنے کے لیے سب سے پہلا کام حکمت عملی کی منصوبہ بندی ہوتی ہے۔ اس کے تحت استاد کو مضمون کے مواد کو مختلف اکائیوں (Unit) میں اس طرح تقسیم کرنا ہوتا ہے کہ ان کی ترتیب آسان سے مشکل کی جانب ہو۔ پھر اس اکائی کی تدریس کے لیے درکار ساز وسامان، تدریس کا طریقہ، درجہ میں تمام طلبہ کو دی جانے والی تعلیمی ہدایت، ہر اکائی کی تدریس کے نتیجے میں ہونے والی آموزش کی جانچ کے لیے تشکیلی جانچ (Formative Test) کی تشکیل اور مختلف گروپوں کے لیے متبادل تدریسی حکمت عملی، آموزش کے دوران آنے والی مشکلات کو دور کرنے کے لیے مخصوص تدریسی حکمت عملی کی منصوبہ بندی، ماہرانہ آموزش کے لیے لازمی اقدامات ہیں۔

منصوبہ بندی کے بعد ماہرانہ آموزش کے لیے تدریس کی جاتی ہے۔ ماہرانہ آموزش کی تدریس کے اقدامات کی ذیل میں مزید وضاحت کی گئی ہے۔

1. ماہرانہ آموزش کے لیے طلبہ کو تیار کرنا۔ (Orienting Students for Mastery Learning)
2. خاص مقاصد کی تحریر (Specification and Writing of Specific Objectives)
3. مہارت کے معیار کا تعین (Determination of the mastery Standard)
4. ابتدائی گروہی تدریس (Initial Group - based Instruction)
5. تجاویز/اصلاحی تدریس (Prescription / Remedial Instruction)

تشخیص کے مطابق اصلاحی ہدایت جس میں مندرجۂ ذیل اقدام شامل ہیں، دی جائے گی۔

(i) انفرادی اتالیقی (Individual Tutoring)
(ii) چھوٹے گروپ میں مطالعاتی نشست (Small Group Study Session)
(iii) متبادل موادِ آموزش (Alternative Learning Material)

1. ماہرانہ آموزش کے لیے سب سے پہلے استاد کو مہارت کی حکمت عملی (Mastery Strategy) تیار کرنا اور ماہرانہ آموزش سے طلبہ کو متعارف کرانا ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ طریقۂ تدریس ایک غیر روایتی طریقہ ہے۔ اس لیے پہلے طلبہ کو اس سے واقف کرانا ضروری ہے۔ استاد کو اس کی افادیت اور اس طریقے کے تحت طلبہ سے کی جانے والی آموزشی توقع کی وضاحت کرنی ہوگی۔ انھیں یہ بھی بتانا ہوگا کہ ان کی آموزش کی جانچ کا طریقہ کیا ہوگا اور یہ بات واضح کی جائے گی کہ طلبہ کی درجہ بندی ان کی آخری جانچ کی بنیاد پر ہوگی نہ کہ دوران تدریس ہونے والی جانچ کی بنیاد پر۔ یہ بھی واضح کر دیا جائے گا کہ ان کی درجہ بندی پہلے سے طے شدہ آموزشی معیار کے حصول کی بنیاد پر ہوگی۔ یہ بتانا بھی ضروری ہوگا کہ ان کی کارکردگی دوسرے طلبہ کی کارکردگی پر منحصر نہیں ہوگی۔

2. ماہرانہ آموزش پر مبنی تدریس کا دوسرا مرحلہ ہدایتی مقاصد کا واضح تعین ہوتا ہے۔ یعنی کس مضمون میں کون سا مواد نصاب میں شامل ہے محض اس کی تفصیلی نشاندہی ماہرانہ آموزش کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ نصاب کی کسی اکائی کی تدریس سے طلبہ میں جن لیاقتوں اور ہنر کی افزائش ہوگی ان کی وضاحت کرنا ضروری ہے۔

یعنی آموزش یا تدریس کے نتیجے میں طلبہ کن سوالات کے جوابات دے سکیں گے اور جن جن مسائل کو حل کر پائیں گے ان کی نشاندہی اور وضاحت لازمی ہے۔ پھر ان تدریسی مقاصد پر مبنی ایک سوالنامہ کی تشکیل ہوگی جس کی مدد سے اس بات کی جانچ کی جا سکے کہ طلبہ ان مقاصد کے حصول میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ اس قسم کی میزانی جانچ میں کتنے نمبروں پر ماہرانہ معیار (Mastery Standard) قائم کیا جائے گا اس کا تعین بھی کیا جائے گا۔ اس کے لیے پہلے بیان کیے گئے طریقوں میں سے کسی ایک طریقے کو اپنایا جا سکتا ہے۔

3. ان مراحل کے بعد درجہ میں موجود تمام طلبہ کو مضمون کی پہلی اکائی پڑھائی جاتی ہے۔ تدریس کے دوران استاد پہلے سے تیار شدہ منصوبے پر عمل کرتا ہے اور اس کی یہ کوشش رہتی ہے کہ طلبہ کو ایک مختلف قسم کا آموزشی تجربہ ہو تاکہ پہلے ہی مرحلے میں زیادہ سے زیادہ طلبہ ماہرانہ معیار کی آموزش کر لیں۔ دوران تدریس استاد طلبہ سے سوالات کرتا ہے۔ ان کی مشکلات معلوم کرتا ہے اور انھیں دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ عملی مشق کے مواقع فراہم کرتا ہے اور پھر ہر اکائی کی تدریس کے اختتام پر ایک جانچ لیتا ہے۔ جس کا مقصد یہ معلوم کرنا ہوتا ہے کہ اس اکائی میں کتنے طلبہ کی آموزش ماہرانہ معیار تک ہو گئی ہے اور جن طلبہ کی آموزش ماہرانہ معیار تک نہیں ہو پائی ہے اس کے کیا اسباب ہیں اور آموزش میں کہاں کمزوری رہ گئی ہے۔

4. تشکیلی (formative) جانچ کی بنیاد پر ان طلبہ کی پہچان ہو جاتی ہے جن کی اس اکائی میں آموزش مہارت کے معیار تک نہیں ہو پائی ہے اور یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ کمی یا مشکل کہاں ہے۔ کمزوری کی تشخیص کی بنیاد پر ایسے طلبہ کے لیے اصلاحی تدریس کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس کے لیے مختلف حکمتِ عملیاں اپنائی جاتی ہیں۔ جن میں مندرجۂ ذیل خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔

(i) **انفرادی تعلیم کا انتظام:** درجہ میں کچھ طلبہ ایسے ہوتے ہیں جو چیزوں کو جلد نہیں سیکھ پاتے یا گروہ میں نہیں سیکھ پاتے۔ ان پر انفرادی اور خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے ان کی مشکلات کو دور کرنے کے لیے استاد کو الگ سے دھیان دینا پڑتا ہے۔ اس کام کے لیے ان کی تدریس کی ذمہ داری ان طلبہ کو دی جا سکتی ہے جن کی آموزش ماہرانہ معیار تک ہو چکی ہے۔

(ii) کچھ طالب علم خود کر کے ہی سیکھ پاتے ہیں۔ اس لیے ایسے طلبہ کو خود سے کر کے سیکھنے کو کہا جا سکتا ہے۔ انھیں کام (Task) سپرد کر دینا ہی ان کی آموزش کے لیے بہتر ہوتا ہے۔

(iii) کچھ طلبہ صرف استاد سے ملنے والی ہدایت سے نہیں سیکھ پاتے بلکہ انھیں سیکھنے کے لیے چھوٹے سے گروپ میں ایک دوسرے سے بات چیت اور گروپ میں مطالعہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے ایسے طلبہ کو گروپ میں مطالعہ کے مواقع فراہم کرانا ماہرانہ آموزش کے لیے ضروری ہوتا ہے۔

(iv) اس کے علاوہ مختلف قسم کے طلبہ کی ماہرانہ آموزش کے لیے مختلف قسم کے مواد/سامان کی ضرورت ہوتی ہے۔ کوئی بہتر تب سیکھ سکتا ہے جب اسے زیادہ مشق کرنے کا موقع ملے۔ کسی کے سیکھنے کے لیے زیادہ مثالوں کی ضرورت ہوتی ہے تو کسی کے لیے ایسی چیزیں درکار ہوتی ہیں جنھیں وہ سن اور دیکھ سکیں۔ بعض طلبہ کے لیے کسی تصور کی آموزش کے لیے اسے آسان حصوں میں تقسیم کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس لیے اصلاحی تدریس کے تحت نہ صرف متبادل طریقۂ تدریس درکار ہوتا ہے بلکہ متبادل سامان کی مدد سے مختلف طلبہ کی ماہرانہ آموزش ممکن ہوتی ہے۔ اس لیے ضرورت کے مطابق متبادل درسی کتب، مختلف سمعی و بصری امدادی سامان، تعلیمی کھیل، مشقی کتب، پروگرام شدہ آموزش کا استعمال کیا جاتا ہے۔

تدریس، جانچ، باز افزائش اور اصلاحی تدریس کا یہ عمل تب تک چلتا رہے جب تک کسی اکائی کو پڑھنے والے تمام طلبہ کی آموزش ماہرانہ سطح کی نہ ہو جائے اور اس کے بعد ہی دوسری اکائی کی تدریس شروع کی جاتی ہے۔

ماہرانہ آموزش پر مبنی تدریس کا آخری مرحلہ تمام اکائیوں کی تدریس کے بعد ہدایتی مقاصد پر مبنی میزانی (Summative) جانچ کی بنیاد پر طلبہ کی درجہ بندی (Grading) کرنی ہوتی ہے اور اس طرح ان طلبہ کو "A" درجہ دیا جاتا ہے جو ماہرانہ معیار حاصل کر پائے ہوں۔ اس سے کم درجہ پانے والے طالب علم غیر ماہر یا Non master تصور کیے جاتے ہیں۔

مندرجہ بالا تفصیلات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ماہرانہ آموزش پر مبنی طریقۂ تدریس:

- طلبہ میں خود اعتمادی پیدا کرنے میں معاون ہوتا ہے۔
- تمام طلبہ کے ماہرانہ معیار کی آموزش کا ضامن ہوتا ہے۔
- تعلیم کے مساوی مواقع اور مساوی معیار کے اصول پر کارفرما ہے۔
- مقابلہ آرائی کے بجائے طلبہ میں تعاون و اشتراک کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔
- طلبہ کو اپنے انداز اور اپنی پسند کے تجربات کرنے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ اس طریقۂ تدریس کی کچھ حدود بھی ہیں۔
- یہ طریقۂ آموزش کو ہمیشہ سلسلہ وار اور استدلالی تصور کرتا ہے۔
- یہ طریقہ نصابی آموزش کے حصول کو ذہانت سے آزاد تصور کرتا ہے۔
- اس کے اپنانے میں زیادہ وقت درکار ہوتا ہے۔
- یہ طریقہ استاد کی ذمہ داری بڑھانے والا ہے۔

ٹیم تدریس

ٹیم تدریس (Team Teaching) روایتی طریقۂ تدریس کے مقابلے میں قدرے نیا طریقۂ تدریس ہے۔ اس طریقے کو آج دنیا کے کئی حصوں خصوصاً امریکہ کے اسکولوں میں اپنایا گیا ہے۔ گذشتہ صدی میں رسمی تعلیم کا پھیلاؤ تقریباً پوری دنیا میں ہوا ہے، جس کے نتیجے میں اسکولوں میں طلبہ کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا ہے مگر اس کے مقابلے میں اساتذہ کی تعداد میں اس تناسب سے اضافہ نہیں ہوا ہے۔ ہمارے ملک میں بھی آج ابتدائی اسکولوں میں طلبہ کی تعداد عموماً کافی زیادہ ہوتی ہے اور ایسی صورت میں ایک استاد کے لیے درجہ میں موجود تمام طلبہ پر فرداً فرداً نگاہ رکھنا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے لیکن اگر درجہ میں ایک استاد کے بجائے کئی اساتذہ موجود ہوں تو ہر طالب علم پر انفرادی دھیان دینا ممکن ہو جائے گا۔

تدریس کا عمل ایک پیچیدہ عمل ہے۔ اس میں استاد کو مختلف کام کرنے ہوتے ہیں مثلاً اسے طلبہ کو کچھ چیزیں دکھانی پڑتی ہیں، کبھی انھیں کسی عنوان یا مضمون کی وضاحت کرنی ہوتی ہے۔ کبھی ان سے سوالات کرنے ہوتے ہیں

اور عموماً یہ تمام کام انھیں یکے بعد دیگرے ایک ہی درجہ میں کرنا پڑتے ہیں۔ مگر کسی بھی استاد میں ان مختلف النوع کاموں کو کرنے کی یکساں مہارت نہیں ہوتی۔ کوئی استاد مضمون کی بہتر وضاحت وتشریح کرسکتا ہے تو کوئی دوسرا بہتر تدریسی وتعلیمی سامان کا استعمال اور اس کا مظاہرہ کرسکتا ہے تو کوئی درجہ میں طلبہ سے بہتر طریقے سے کام کروا سکتا ہے۔ اگر درجے میں تدریس کے دوران ایک کی بجائے کئی اساتذہ ہوں اور ان میں سے ہر ایک کی الگ الگ کاموں کے کرنے کی مہارت ہو اور یہ سب منصوبہ بند طریقے سے اپنی مہارت کا استعمال طلبہ کی تدریس کے لیے کریں تو اس مشترکہ کوشش کے نتیجے میں بہتر آموزش کی امید کی جاسکتی ہے۔ اس طریقۂ تدریس کو ہی عموماً ٹیم تدریس کہتے ہیں۔

ٹیم تدریس کی ضرورت اس وقت بھی محسوس ہوتی ہے جب تدریسی مواد ایسا ہو جس میں مختلف مضامین (Subjects) کے علوم (حقائق، مفروضات و اصول، قانون) کا مجموعہ تیار کیا گیا ہو۔ مثلاً آج ابتدائی مدارس میں سائنس کی تعلیم ماحولیاتی سائنس کے طور پر دی جاتی ہے اور اعلیٰ ابتدائی درجہ میں سائنس Integrated Science کے طور پر پڑھائی جاتی ہے۔ ماحولیاتی سائنس یا Integrated Science کا درسی مواد سائنس کے مختلف شعبوں سے لیا جاتا ہے۔ اس لیے اس کی تدریس کسی ایسے استاد کے ذریعے بہتر انداز سے ممکن نہیں ہوتی جس کی مہارت سائنس کے کسی ایک ہی شعبے میں ہو۔ اس کا بہتر متبادل یہ ہوسکتا ہے کہ سائنس کے مختلف شعبوں کے اساتذہ اگر ایک ساتھ مشترکہ طور پر تدریس کریں تو ماحولیاتی یا Integrated سائنس کے درسی مواد کی بہتر وضاحت ممکن ہوسکتی ہے۔ اس لیے ٹیم تدریس ایسی صورت میں بہتر متبادل ہوسکتی ہے۔ ذیل میں ٹیم تدریس کی مزید وضاحت کی گئی ہے اور ٹیم تدریس کو درجہ میں کس طرح اپنایا جاسکتا ہے اس پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

ٹیم تدریس کیا ہے؟

ٹیم تدریس سے مراد ایک جدید تدریسی پروگرام ہے جس میں دو یا دو سے زائد اساتذہ طلبہ کی تعلیم کے لیے ایک ساتھ درس و تدریس کی منصوبہ بندی اور اس کا انعقاد کرتے ہیں اور اس کے نتیجے میں درجہ میں موجود طلبہ کو جو کچھ تعلیمی تجربات فراہم کیے جاتے ہیں اس کا اعادہ بھی کرتے ہیں۔ عموماً ٹیم تدریس میں 2 سے 4 اساتذہ حصہ لیتے ہیں مگر خصوصی حالات میں یہ تعداد زیادہ بھی ہوسکتی ہے۔

Warwick نے ٹیم تدریس کی تعریف یوں کی ہے۔

ٹیم تدریس تنظیم کی ایک ایسی شکل ہے جس میں استاد انفرادی طور پر وسائل کی فراہمی، دلچسپی اور مہارت کے حصول کا فیصلہ کرتا ہے تاکہ کام (تدریسی کام) کی مشترکہ منصوبہ بندی اور اس کا نفاذ اس طرح کیا جاسکے۔ جو طلبہ کی ضرورتوں اور ادارے کی سہولیات کے مطابق ہو۔

مندرجہ بالا تعریف سے ٹیم تدریس کی درج ذیل خصوصیات کا اظہار ہوتا ہے۔

1. ٹیم تدریس میں ایک سے زائد استاد حصہ لیتے ہیں۔
2. ہر ایک استاد انفرادی طور پر وسائل، دلچسپی کے سامان اور خصوصی مہارت کی فراہمی کی کوشش کرتا ہے۔
3. تمام اساتذہ جنھیں مشترکہ تدریس میں حصہ لینا ہوتا ہے، ایک تنظیم کے طور پر کام کرتے ہیں۔
4. تدریس کے لیے مشترکہ منصوبہ بندی کی جاتی ہے اور اس کا نفاذ مقررہ منصوبے کے مطابق کیا جاتا ہے جس میں مختلف اساتذہ کا رول اور کام متعین ہوتا ہے۔
5. تدریس کے دوران طلبہ کو جو آموزشی تجربات فراہم کیے جاتے ہیں ان کا اندازۂ قدر یا اعادہ بھی مشترکہ تدریس کے دوران کیا جاتا ہے۔

ٹیم تدریس کیسے کی جائے؟

ٹیم تدریس چونکہ ایک ایسا طریقۂ تدریس ہے جس میں ایک سے زائد اساتذہ ایک ساتھ حصہ لیتے ہیں اس لیے اس طریقۂ تدریس کو درجہ میں اپنانے کے لیے تین مراحل سے گزرنا لازمی ہوتا ہے۔

1. ٹیم تدریس کی منصوبہ بندی۔
2. ٹیم تدریس کا انعقاد۔
3. تدریس کے بعد شریک اساتذہ کی کارکردگی کا مشترکہ اعادہ۔

ٹیم تدریس کی منصوبہ بندی

ٹیم تدریس ایک اجتماعی طریقۂ تدریس ہے اس لیے اس طریقۂ تدریس کی منصوبہ بندی تمام اساتذہ کی شرکت سے ہونی چاہیے۔ لیکن سب سے پہلے ٹیم تدریس کے مقاصد اور اس کی اہم خصوصیات سے تمام شریک اساتذہ کا واقف ہونا ضروری ہوتا ہے۔ ٹیم تدریس ایک رضاکارانہ عمل ہے اس لیے اس میں صرف وہی اساتذہ حصہ لے سکتے ہیں جو اس کے لیے خود کو رضاکارانہ طور پر پیش کرسکیں۔ شرکا کا مختلف قسم کی مہارت رکھنے والا ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔ تدریسی مواد کے مطابق مختلف اساتذہ آپس میں اپنی اپنی مہارت کے لحاظ سے مختلف رول نبھانے کی ذمہ داری لیتے ہیں۔ ٹیم تدریس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ٹیم کا کوئی لیڈر (قائد) ہو۔ عام طور پر درجہ کا مستقل استاد ہی قائد مقرر کیا جاتا ہے۔ اپنے رول کے مطابق مختلف اساتذہ متعین مضمون کی تدریس کے لیے وسائل کی فراہمی کا منصوبہ بناتے ہیں۔ ٹیم تدریس کے لیے ٹیم بناتے وقت کبھی کبھی باضابطہ استاد کے علاوہ کچھ دوسرے لوگوں کو بھی ٹیم

میں شامل کیا جاتا ہے اور انھیں ایک خاص رول دیا جاتا ہے۔ مثلاً سائنس میں کسی بیماری کے متعلق پڑھاتے وقت تدریسی مواد کے کچھ حصے کی وضاحت کسی ڈاکٹر کے ذریعے کرائی جاسکتی ہے یا سمعی و بصری (Audio Visual) سامان کا استعمال کوئی اس فن کا ماہر کرسکتا ہے۔ پوری کلاس کا نظم و نسق برقرار رکھنے کی ذمہ داری ٹیم کے قائد کی ہی ہوتی ہے۔ درجہ میں مواد کی پیش کش کے طریقے اور ترتیب کا تعین بھی منصوبہ بندی کا اہم جز ہوتا ہے۔

عام طور پر ٹیم تدریس مندرجۂ ذیل میں سے کسی ایک حالت میں کی جاتی ہے۔

1. جب درجہ میں طلبہ کی تعداد کافی زیادہ ہو۔
2. درجہ میں طلبہ کی تعداد بہت کم ہو۔
3. طلبہ آزادانہ مطالعہ کر رہے ہوں۔

کبھی کبھی درجہ میں طلبہ کی تعداد کافی زیادہ ہوتی ہے اور ایک استاد کے لیے نہ تمام طلبہ پر توجہ مرکوز رکھنا ممکن ہوتا ہے اور نہ ہی ان کی مناسب تدریس تنہا ممکن ہوتی ہے۔ اس صورت میں ٹیم تدریس کو ایک متبادل کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اس کے انعقاد کے لیے ٹیم کا قائد تدریس کا آغاز کرتا ہے جس میں مختلف امدادی سامان مثلاً سلائڈ، ٹرانسپرنسی، OHP یا فلم وغیرہ کا استعمال کیا جاتا ہے اور ان چیزوں کا استعمال اور مظاہرہ ٹیم میں موجود دوسرے اساتذہ کرتے ہیں۔

پورے درجہ میں تدریس کرنے کے بعد مختلف اساتذہ طلبہ کو الگ الگ ٹولیوں میں تقسیم کر کے ان سے گفتگو کرتے ہیں اور ان کے شکوک وشبہات کو دور کرتے ہیں۔ اس طرح درجہ میں زیادہ طلبہ کی موجودگی کے باوجود ہر طالب علم کو ذاتی آموزش کے مواقع اور ان کے مسائل کے حل کے امکانات بہتر ہو جاتے ہیں۔

مشترکہ تدریس کا طریقہ چھوٹے گروپ میں بھی موثر انداز میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ایسی صورت میں ٹیم کے مختلف ممبران اپنی اپنی مہارت کے لحاظ سے مواد کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ کلاس میں کی گئی تدریس پر مبنی مختلف سوالات اور شکوک اور مزید معلومات کی خواہش مختلف طلبہ کے دماغ میں ان کی اپنی ذہنی صلاحیت اور دلچسپی کی بنیاد پر، پیدا ہونا فطری ہے۔ ٹیم میں شامل اساتذہ دوران تدریس ان مسائل کا حل، شکوک وشبہات کا ازالہ یا مزید معلومات اپنی مہارت کے بقدر پیش کرتے ہیں۔ اس طرح طلبہ کے ذریعے ملنے والی باز افزائش دوران تدریس تبدیلی اور سدھار کا ذریعہ بھی ہوتی ہے۔

ٹیم تدریس کا انعقاد طلبہ کے آزادانہ مطالعے کے لیے بہت موثر انداز میں کیا جاسکتا ہے۔ اس صورت میں ٹیم کا قائد مطالعے کے لیے مواد کا مختصر تعارف اور آموزشی مقاصد کی وضاحت شروع ہی میں کر دیتا ہے۔ پھر ہر طالب علم کو اس کا کام سپرد کر دیا جاتا ہے۔ ٹیم میں موجود اساتذہ طلبہ کو ضروری سامان مثلاً کتب، Work book، تجربہ کرنے کے لیے ضروری آلات و سامان فراہم کرتے ہیں، ہر طالب علم کو آموزشی مقاصد کی وضاحت کرتے ہیں اور اگر انھیں مطالعے کے دوران کوئی مشکل پیش آتی ہے تو اس کے حل میں ان کی رہنمائی کرتے ہیں۔

اس طرح ٹیم تدریس کے دوران ٹیم میں شامل اساتذہ منصوبے کے تحت تدریس کے مختلف حصوں کو باہمی تعاون و اشتراک سے موجود طلبہ کی تعداد، ان کی ضرورتوں اور ادارے میں موجود سہولیات کے مطابق انجام دیتے ہیں۔ دوران تدریس باز افزائش کا مستقل نظم قائم کیا جاتا ہے تاکہ تدریس کو طلبہ کے لیے زیادہ مفید، دلچسپ اور آموزش کا موثر ذریعہ بنایا جاسکے۔

تدریس کے بعد عموماً ٹیم میں شریک اساتذہ کی نشست ہوتی ہے جس میں شرکا مشترکہ تدریس کی کمیوں اور قوتوں کا معروضی جائزہ لیتے ہیں اور کارکردگی کا اعادہ کرتے ہیں تاکہ مستقبل میں ٹیم تدریس کو زیادہ موثر بنایا جاسکے۔

مندرجہ بالا گفتگو کے نتیجے میں مشترکہ تدریس کی کچھ اہم خوبیوں کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔

- مختلف اساتذہ کی مہارت سے طلبہ ایک ساتھ استفادہ کرسکتے ہیں۔
- جماعت میں کثیر تعداد میں موجود طلبہ کی ذاتی نگرانی اس طریقۂ تدریس میں ممکن ہوتی ہے۔
- ایسا درسی مواد جس کی تدریس کے لیے مختلف مضامین کی معلومات کی ضرورت ہو ٹیم تدریس کے ذریعے زیادہ موثر طریقے سے پڑھایا جاسکتا ہے۔
- ٹیم میں شامل ہر استاد کو اپنی بہترین کارکردگی کے مظاہرے کا موقع ملتا ہے۔ مگر ٹیم تدریس کی کچھ حدود بھی ہیں، جیسے:
- ٹیم تدریس کے لیے دو یا اس سے زائد اساتذہ کا رضاکارانہ تعاون حاصل ہونا ہمیشہ ممکن نہیں ہوتا۔
- ہمارے ملک میں جہاں کئی درجات کو ایک ہی استاد کو ایک ساتھ پڑھانا پڑتا ہے وہاں ایک درجہ کو پڑھانے کے لیے دو یا دو سے زائد اساتذہ کا مل پانا موجودہ نظام میں تقریباً ناقابل عمل ہے۔
- ٹیم میں تدریس کے لیے مشترکہ منصوبہ بندی ایک مشکل عمل ہے۔
- ٹیم کے قائد کی قائدانہ صلاحیت بدرجۂ اتم درکار ہوتی ہے۔

□□□

ریاض احمد

اردو نصاب — سیکنڈری اور سینئر سیکنڈری سطح پر

عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ اُردو تدریس کے نصابات تیار کرتے وقت طلبہ کی عمر،نفسیات ،ان کا سماجی پس منظر،تعلیمی معیار اور سابقہ درجات سے مطابقت کا خیال نہیں رکھا جاتا جبکہ صحیح سمت میں آموزش کے لیے ان باتوں کا خیال رکھنا بے حد ضروری ہے۔ ہندوستان جیسے وسیع وعریض ملک میں جہاں متعدد ریاستوں کو اول تا اعلیٰ ثانوی تعلیم پر پوری طرح کنٹرول حاصل ہے ،اردو کے نصاب میں یکسانیت نہیں ہے خواہ وہ نصاب کی ترتیب میں ہو، درجات کی ترتیب میں یا پھر نصابی مواد کی ترتیب میں ۔ حالانکہ اردو کی بہتر ترویج وترقی اور اس زبان کی بہتر ترسیل کے لیے ہونا یہ چاہیے تھا کہ تمام ریاستوں کی نصابی کتابیں درجات ،نصاب اور مناسب ترسیل کے لحاظ سے ایک جیسی ہوں تا کہ یکساں آموزشی ہدف(ٹارگٹ) ان ریاستوں کی ادبی ،سماجی ،تہذیبی اور ثقافتی ورثے کا خیال رکھتے ہوئے حاصل کیا جا سکے۔

کچھ ریاستوں میں اردو کی تدریس کو نمایاں حیثیت حاصل ہے جن میں جموں وکشمیر ،بہار،دلی،آندھرا پردیش ،مہاراشٹر اور کرناٹک کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ کیفیت اور کمیت یعنی (Quality and Quantity) دونوں لحاظ سے ،ہمارے ملک میں کچھ تعلیمی وتحقیقی ادارے ایسے ہیں جہاں اردو کی تدریس کے لیے بہتر اسکولی نصاب کی تیاری اور تدریس کا انتظام ہے جس میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، حیدرآباد اور ممبئی کے متعدد تعلیمی ادارے ، جبکہ اسکولی نصاب کی تدوین و اشاعت میں قومی سطح پر این.سی.ای.آر.ٹی. کی حیثیت مسلّم ہے ۔ این سی ای آر ٹی کے علاوہ جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ کئی ریاستوں کے سیکنڈری ایجوکیشن بورڈ بھی نصابی کتابوں کی تدوین و اشاعت کا کام کرتے ہیں۔لیکن مجموعی طور پر مذکورہ بالا اشاعتی اداروں کی کتابوں میں معیار کا فرق پایا جاتا ہے۔

اردو نصاب کی موجودہ صورت حال تو یہ ہے کہ وہی شاعر و ادیب اور ان کے فن پارے ایک ریاست میں نویں درجہ میں شامل ہیں تو دوسری ریاستوں میں گیارھویں میں یا آٹھویں میں۔ اس ضمن میں، نہ تو ترتیب کا خیال رکھا جاتا ہے اور نہ زمانے کا (زمانے سے ہماری مراد زبان اور ادبی اصناف کے ارتقا سے ہے)۔ جہاں تک معیار کا سوال ہے تو عام طور سے مختلف ریاستوں میں معیار کی جانچ اور سطح کا اندازہ لگانے کا طریقہ بھی مختلف ہے۔ ثانوی اور اعلیٰ ثانوی سطح پر طلبہ کی عمر ایک نازک موڑ پر ہوتی ہے۔ اس موڑ پر زبان و ادب کے نصابات تیار کرتے وقت نہایت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی وہ سطح ہے جب طلبہ اعلیٰ تعلیم کے لیے تیار کیے جاتے ہیں۔ صوبوں اور مرکزی سطح پر تیار کیے گئے نصابات میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے یا یوں کہا جائے تو بے جانہ ہوگا کہ طلبہ پر نصاب کا بوجھ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ ثانوی سطح پر طلبہ کے لیے ایک مشکل اور درپیش ہوتی ہے کہ اس سطح پر زبان و ادب کے علاوہ دیگر مضامین بھی لازمی ہوتے ہیں یعنی 10+2+3 نظام کے مطابق دسویں یا میٹرک میں تقریباً تمام صوبوں میں دو یا تین زبانوں کے علاوہ تمام سائنسی وسماجی مضامین لازمی ہوتے ہیں۔ اس طرح نصاب کے بوجھ کو کم کرنے کی جب بھی بات آتی ہے تو زبان کے خاص طور سے اردو کے نصاب میں کمی کردی جاتی ہے۔

ثانوی سطح سے اعلیٰ ثانوی سطح کا معیار ہر لحاظ سے الگ ہوتا ہے۔ اس سطح پر طلبہ اپنے مزاج،تقاضے اور سہولت کے لحاظ سے مضامین کا انتخاب کرتے ہیں۔ یہ سطح تعلیمی اعتبار سے اعلیٰ تعلیم اور ثانوی تعلیم کے درمیان کی ایک مضبوط کڑی ہوتی ہے۔ اس سطح پر طلبہ اپنے مستقبل کے کیریئر کا انتخاب کرتے ہیں۔مختلف مقابلہ جاتی امتحانات میں پوچھے جانے والے سوالات کا معیار بھی یہی سطح ہوتی ہے۔ عام طور سے مقابلہ جاتی امتحانات کے انٹرویو میں بھی سوالات انھی درجات کے نصابات سے ہوتے ہیں غرض کہ یہ سطح ہر لحاظ سے طلبہ کے پورے کیریئر کو متاثر کرنے والی ہوتی ہے۔ اردو کے اس سطح کے نصابات تیار کرتے وقت افراد یا اداروں کو جن امور کو مدنظر رکھنا چاہیے ان میں چند اہم یہ ہیں:

- طلبہ میں زبان کے تخلیقی استعمال کی صلاحیت پیدا کرنا۔
- ان میں اس زبان کے ذریعے دوسرے مضامین کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرنا۔
- زبان کے ذریعے قومی ہم آہنگی کو فروغ دینا۔
- اعلیٰ انسانی اقدار کا فروغ اور خود اعتمادی پیدا کرنا۔

- طلبہ میں اپنی زبان کے مختلف ادب پاروں کی لسانی خوبیوں کو سمجھنے کا شعور پیدا کرنا۔
- ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کرنا۔
- اپنی زبان کے ذریعے دیگر زبانیں سیکھنے کا شعور بیدار کرنا۔
- طلبہ میں صحیح زبان استعمال کرنے اور ادبی خوبیوں کو جانچنے کا شعور پیدا کرنا۔
- نثر ونظم کی مختلف اصناف کو سمجھنے اور ان میں فرق واضح کرنے کا شعور بیدار کرنا۔
- ادبی، غیر ادبی، قدیم اور جدید متون میں فرق واضح کرنا۔
- کلاسیکی اور غیر کلاسیکی ادب میں فرق واضح کرنا۔

مندرجہ بالا شعوری کوششوں کے علاوہ نصاب کی کتابوں میں اسباق کے آخر میں معنی اور اشارے، تفہیمی سوالات، مشقی اشارے، حوالے اور عملی قواعد سے متعلق مشق شامل ہونا چاہیے۔ جبکہ متعدد ریاستوں کی نصابی کتابوں میں اسباق کے آخر میں نہ تو مشق موجود ہوتی ہے نہ قواعد اور نہ عملی قواعد کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ حالانکہ مذکورہ بالا سطحوں پر مشق ضروری ہی نہیں لازمی بھی ہے۔ اس کے بغیر سبق ادھورے ہیں کیونکہ ادبیات اور اصناف سخن سے تعلق رکھنے والے اسباق میں قدیم متون بھی شامل ہوتے ہیں نیز شاعری میں بہت سے رموز و نکات بیان کیے جاتے ہیں جن کی طرف اشارے کرنا اور ان کی وجہ تسمیہ و تاریخی نشان دہی کرنا طلبہ کے لیے نہایت مفید ہوتا ہے تاکہ وہ خود بھی ان متون کو سمجھنے کی سعی کریں اور ان میں خالص ادبی رجحان پیدا ہو۔ ان اشارات سے اساتذہ کو بھی مدد ملتی ہے۔ این سی ای آر ٹی کے ذریعے تیار کرائے گئے ثانوی اور اعلیٰ ثانوی درجات کی درسی کتابوں میں مذکورہ بالا نکات کا خیال رکھا جاتا ہے۔ چنانچہ آپ ان درجات کی کسی بھی درسی کتاب کا جائزہ لیں خواہ ان کے اسباق نثر سے تعلق رکھتے ہوں یا نظم سے ان میں معنی و اشارے، غور کرنے کی بات، مشق اور مطالعہ اور کہیں کہیں ادبی حوالے ضرور دیے جاتے ہیں جب کہ کئی ریاستوں کے ثانوی اور اعلیٰ ثانوی درجات میں ان باتوں کا اہتمام نہیں کیا جاتا۔ (یہاں طوالت کے خوف سے جموں وکشمیر کے ان درجات کی نصابی کتابوں کا ہی حوالہ پیش کیا جا رہا ہے۔)

نویں، دسویں کی کتابوں میں تو اشارے، معنی اور مشقی سوالات مل بھی جاتے ہیں لیکن گیارھویں اور بارھویں یعنی اعلیٰ ثانوی درجات کی کتابوں میں یہ حصے عام طور پر مفقود ہوتے ہیں۔ اس سے بھی حیرت انگیز بات دیکھنے کو ملتی ہے مثلاً ریاست جموں وکشمیر میں گیارھویں اور بارھویں میں جو کتاب نصاب میں شامل ہے اس میں نہ تو مؤلفین کے نام ہیں نہ سن طباعت۔ بس اس کے سرورق پر یہ لکھا ہے ''جدید ادبی نصاب گیارھویں / بارھویں جماعت کے لیے اسٹیٹ بورڈ آف اسکول ایجوکیشن کے نصاب کے مطابق۔'' ناشر کے کالم میں ''کے بی ٹی بکس (انڈیا)'' لکھا ہوا ہے جس کا نہ پتہ ہے نہ نمبر۔ کتاب جہاں چھپی ہے یعنی مطبع کے کالم میں ''الس ان کور پوریٹ''۔ اب بھلا کوئی طالب علم، کوئی استاد یا کوئی ادارہ ایسی کتابوں سے متعلق کچھ کہنا چاہے تو کس سے کہے۔ ان کتابوں کی اندرونی کوتاہیوں کی طرف آئندہ صفحات میں اشارہ کیا جائے گا فی الحال ایک اور کوتاہی جو اس کتاب کو مزید مشکوک بناتی ہے وہ یہ ہے کہ بارھویں درجے کی کتاب میں تو چند عامیانہ مشقی سوالات درج ہیں لیکن گیارھویں درجے کی کتاب میں کوئی مشقی سوالات یا اشارے نہیں ہیں۔ اگر مشقی سوالات نہیں ہوں گے تو طلبہ کو اپنی صلاحیت کی جانچ اور اظہار انفرادیت کا موقع بہت کم دستیاب ہو سکے گا۔ نصابی کتابوں کا مطلب صرف کتابوں کا بوجھ نہیں بلکہ نصاب بتدریج معلوم سے نامعلوم کی طرف اور آسان سے مشکل کی طرف آسانی سے پہنچنے کا بہترین راستہ ہے۔ جموں وکشمیر کیا، کئی ریاستوں کے اس سطح کے نصاب اس آسانی سے پہنچنے کے راستے کی نفی کرتے ہیں۔

عام طور سے ثانوی اور اعلیٰ ثانوی سطح کی اردو زبان کی نصابی کتاب تیار کرتے وقت مندرجۂ ذیل مخصوص نکتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔

- نصاب حیات مرکوز ہو
- مشغلہ مرکوز ہو
- ضرورت مرکوز (Need Based) ہو
- طلبہ مرکوز ہو
- نصاب لچکدار ہو
- سماجی افادیت پر مرکوز ہو
- اس میں مضامین کے لحاظ سے انفرادیت ہو
- درجات کے لحاظ سے پختگی ہو
- ترتیب کے لحاظ سے مؤثر ہو اور
- نصاب میں تحقیق کا اصول کارفرما ہو

مذکورہ بالا نکات کے لحاظ سے جب ہم مختلف ریاستوں کی ثانوی اور اعلیٰ ثانوی سطح کے نصابات کا جائزہ لیتے ہیں تو ان میں توازن کی کمی محسوس ہوتی

ہے۔عموماً نصابات شخصیت سازی کے اصول سے عاری ہوتے ہیں اور ان میں انسانی زندگی کے سماجی پہلوؤں سے گہرا ربط نظر نہیں آتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غیر متوازن نصابی کتابوں کو پڑھ کر طلبہ جب کالج / یونیورسٹی کے مختلف درجات میں آتے ہیں تو نہ اظہار خیال پر قدرت ہوتی ہے اور نہ شعر و ادب کی اچھی واقفیت ہوتی ہے۔تحریر وتقریر دونوں ناقص ہوتے ہیں۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دیگر علوم کے طلبہ سے کئی لحاظ سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔

مذکورہ سطح پر نصاب کی تیاری میں دیگر مشکلوں کے ساتھ ساتھ ایک خامی اور دیکھنے کو ملتی ہے کہ ان نصابی کتابوں کی تیاری کے لیے جن ماہرین کی خدمات لی جاتی ہیں ان میں سے زیادہ تر کا تعلق کالج اور یونیورسٹیوں سے ہوتا ہے۔ ان ماہرین کی تعداد بہت کم ہوتی ہے جن کا تعلق انھی درجات کی درس و تدریس سے ہوتا ہے۔ظاہر ہے یونیورسٹی کے اساتذہ کے مقابلے میں اس سطح پر پڑھانے والے اساتذہ کا بالواسطہ تعلق ان درجات سے ہونے کی وجہ سے اس سطح پر آنے والی مشکلات، طلبہ کی نفسیات اور ضرورتوں کا زیادہ تجربہ ہوتا ہے۔ وہ افراد جو اس میدان عمل میں مشغول ہوتے ہیں ان افراد سے بہتر تجربات رکھتے ہیں جو ایئر کنڈیشن کمروں میں بیٹھ کر نصابی درسیات طے کرتے ہیں۔ چنانچہ نصاب تیار کرتے وقت، ان پر ورکشاپ منعقد کرتے وقت اور ان کو حتمی شکل دیتے وقت زیادہ تعداد میں ان اساتذہ کو شامل کرنا چاہیے جو اسکول میں ان درجات کو پڑھانے کا تجربہ رکھتے ہوں اور ان طلبہ کی مشکلات سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ نصاب تیار کرتے وقت اساتذہ کے تربیتی اداروں سے تعلق رکھنے والے (ٹیچرس ٹریننگ کالج) کے اساتذہ، ریاستی سطح کے ثانوی اور اعلیٰ ثانوی تعلیمی انتظامی اداروں سے تعلق رکھنے والے ماہرین اور ایسے ماہرین جو نصاب کی کسی خاص صنف کے ماہر ہوں، کو بھی نصاب تیار کرتے وقت مدعو کیا جانا چاہیے۔

ثانوی سطح پر طلبہ کو عام طور سے رموز اوقاف کے چند ہی علامات جانتے ہوتے ہیں۔ حالانکہ اعلیٰ ثانوی سطح پر طلبہ میں اس کی پوری مہارت کی امید کی جاتی ہے لیکن بہتر یہ ہوگا کہ ثانوی اور اعلیٰ ثانوی درجات کی نصابی کتابوں میں ہر طرح کے اوقاف پر پوری توجہ دی جائے۔ اس سطح کی نصابی کتابوں میں مختلف جدید و قدیم اصناف سے طلبہ کو متعارف کرایا جاتا ہے۔قدیم متون اور شاعری سے تعلق رکھنے والے اسباق میں خاص طور سے اعراب کا خیال بھی رکھا جانا چاہیے تاکہ طلبہ ان کو صحیح صحیح پڑھ سکیں اور ان کو معنی اخذ کرنے میں دشواری نہ ہو۔ اوقاف اور اعراب کے بغیر بہت سے جملے، فقرے اور مصرعوں کا تعین مشکل ہو جاتا ہے۔ شعر کی توضیح، تشریح، مفہوم اور مطالب کو واضح کرنے میں اعراب اور اوقاف کا بہت دخل ہے۔ان نصابی کتابوں میں مشدد حروف پر تشدید لگانا، اضافت کی زیر لگانا ہم ضروری نہیں سمجھتے، کاما یا وقفہ کے نشانات لگانا بھی غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ استفہامیہ یا ندائیہ جملے، بیانیہ اور سوالیہ جملے کا نشان لگانا بھی بھول جاتے ہیں۔ یہ بہت بڑی کوتاہی ہے۔ چنانچہ نصابی کتابوں کو آخری شکل دیتے وقت ان کا خیال ضرور رکھنا چاہیے۔

نصابی کتب تیار کرتے وقت املا کی صحت کا بھی پوری طرح خیال رکھا جانا چاہیے۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ کچھ الفاظ کی مشق ہم پانچویں چھٹی جماعتوں میں اس طرح کراتے ہیں جیسا کہ ان درجات کی نصابی کتابوں میں دیا ہوتا ہے اور بعینہٖ وہی الفاظ نویں، دسویں یا گیارھویں، بارھویں جماعتوں میں ایک ہی لفظ کا املا کسی ایک طرح سے لکھا ہے تو نظم میں کسی دوسری طرح سے طلبہ میں سے کس کو صحیح تصور کریں گے۔ مثلاً

تجکو.....تجھکو۔مجھ کو گذرنا.....گزرنا

ہرج.....حرج بھروسہ.....بھروسا وغیرہ

اس لیے نصابی کتابوں میں املا کے معاملے میں یکسانیت ہونی چاہیے۔ ابتدائی درجات میں کسی لفظ کا املا جس طرح لکھا جائے ثانوی درجات میں بھی اس لفظ کا املا اسی طرح ہونا چاہیے۔ اس لیے ابتدائی درجات کی کتابوں میں الفاظ کے صحیح املا کا تعین ہوجانا چاہیے تاکہ کسی نہج پر طلبہ غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ اگر متفقہ طور پر کسی لفظ کا املا بدل دیا جائے تو اس کی اطلاع طلبہ کو دی جانی چاہیے۔ آٹھویں نویں جماعت تک آتے آتے طالب علم کو یہ بات معلوم ہونے لگتی ہے کہ املا بدلنے سے الفاظ کے معنی بدل جاتے ہیں مثلاً:

چڑیا اپنے بچوں کے لیے (دانہ) لائی ..... اقبال بہت (دانا) انسان تھے۔

ساجد نے اخبار میں دیے گئے (معمہ) کو حل کرلیا..... شمع والا معمہ بہت مشہور ہے۔

اک معمّا ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے؟ خواب ہے دیوانے کا

فانی

ع عبرت طلب ہے حل (معمّاے) آگہی

غالب

طلبہ نے اگر پہلے اس طرح معمہ لکھنا سیکھ لیا ہے اور ثانوی درجات اور اعلیٰ ثانوی درجات میں اس کو ان شعرا کا کلام پڑھنا ہے جن میں "معمّا" اس

طرح لکھا ہوا ہے تو ان کے ذہن میں شبہات گھر کر جائیں گے کہ آخر صحیح املا کیا ہے۔ واضح رہے کہ اگر شعر میں معہ لکھ دیا جائے تو مصرعہ بحر سے خارج ہو جائے گا۔

اس طرح کے دیگر الفاظ بھی مثلاً تماشہ/تماشا، ڈرامہ/ڈراما۔ اگر نصابی کتابوں میں تماشہ لکھا ہوا ہے تو پھر وہ غالب کے اس مصرعہ کو کس طرح پڑھیں گے۔

ع تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

چونکہ ابتدائی درجات میں طالب علم جن حروف/لفظوں کی صورت شناسی کے عمل سے گزرتا ہے وہ ان الفاظ کو پڑھتا بھی ہے، ان کے معنی بھی یاد رکھتا ہے اور ان کی اصل صورت بھی ذہن نشیں کر لیتا ہے اس لیے نصابی کتابوں میں شروع سے آخری درجات تک یکساں اور صحیح املا کا استعمال کیا جانا چاہیے۔

طلبہ کو دیگر زبانوں سے لیے گئے الفاظ کے اصل معنی اور اردو میں مستعمل معنی سے بھی روشناس کرانا چاہیے۔ مثلاً

لفظ	اصل معنی	اردو میں مستعمل معنی
اہلیہ	صلاحیت	بیوی
انکسار	ٹکڑے ٹکڑے ہونا	عاجزی
بخار	بھاپ	بخار (بیماری)
صلاح	نیکی	مشورہ
عرصہ	صحن یا میدان	مدت
اخلاص	خالص کی جمع	پیار، محبت

ان سطحوں پر نصابی کتابوں کے ذریعے جو بھی اطلاعات و معلومات ہم پہنچائے جاتے ہیں طلبہ کے ذہن میں راسخ ہو جاتے ہیں، اس لیے ان درجات کی نصابی کتابوں میں جو اطلاعات دی جائیں، جو علوم فراہم کرائے جائیں، ان کی جانچ کرنا ضروری ہے تاکہ وہ اطلاعات مبہم اور غلط نہ ہوں۔

گیارھویں اور بارھویں کی نصابی کتابوں سے چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

''مومن خاں کی ولادت 1800 میں ہوئی۔''

''53 برس کی عمر میں کوٹھے سے گر کر پانچ مہینے بیمار رہ کر 1851 میں انتقال کیا''۔ (درجہ بارھویں/سبق: مومن خاں مومن صفحہ:155: جدید ادبی نصاب، بورڈ آف اسکول ایجوکیشن، جموں وکشمیر۔

اب کوئی طالب علم کس بیان کو صحیح تسلیم کرے گا، پیدائش کو، انتقال کو یا عمر کو؟

''1857 کے بعد نذیر احمد ڈپٹی انسپکٹر مدارس الہٰ آباد منتخب ہوئے اور یہاں انگریزی پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ چند دنوں میں اس علم کو بھی حاصل کر لیا''...... (درجہ بارھویں، سبق : ڈپٹی نذیر احمد، جدید ادبی نصاب اسٹیٹ بورڈ آف اسکول ایجوکیشن جموں وکشمیر کے صفحہ نمبر 45)

طالب علم کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہوگا کہ کوئی بھی شخص کس طرح چند دنوں میں ''اس علم کو'' انگریزی زبان کو سیکھ لے گا۔

اسی سبق کا آخری پیراگراف ملاحظہ کریں۔

''نذیر احمد اردو کے سب سے پہلے ناول نویس ہیں۔ ان کی تصانیف بنات النعش (1873) مراۃ العروس (1869) اور توبۃ النصوح (1877) سرشار کے پہلے ناول سے بہت قبل شائع ہو چکی تھیں۔'' (درجہ بارھویں سبق ''نذیر احمد''، جدید ادبی نصاب ٹیسٹ بورڈ آف اسکول ایجوکیشن جموں وکشمیر صفحہ نمبر۔57)

کم سے کم میری سمجھ میں تو نہیں آ رہا ہے کہ مؤلف اس پیراگراف میں کیا کہنا چاہتا ہے اور اس سے طلبہ کو کتنا فائدہ ہو رہا ہے یا پھر نقصان ہی نقصان ہے۔

''ولی محمد نام، نظیر تخلص 1740 میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ (درجہ گیارھویں، سبق نظیر اکبر آبادی۔ جدید ادبی نصاب ٹیسٹ بورڈ آف اسکول ایجوکیشن جموں وکشمیر۔ صفحہ 156)

نادر شاہ کے حملے کے وقت دہلی میں پیدا ہوئے۔ کچھ علما نے ان کا سنہ پیدائش 1732 لکھا ہے اور کچھ نے 1735 لکھا ہے (سبق: نظیر اکبر آبادی اردو کی نئی کتاب دسویں جماعت کے لیے این سی ای آر ٹی صفحہ۔275)

اگر کسی طالب علم سے انٹرمیڈیٹ پاس کرنے کے بعد نظیر اکبر آبادی کے پیدائش کے بارے میں معلوم کیا جائے یا مقابلہ جاتی امتحانات میں سوالات پوچھے جائیں تو وہ کیا جواب دے گا۔ این سی ای آر ٹی کی کتاب کو صحیح تسلیم کرے گا یا جموں وکشمیر کی نصابی کتاب کو۔

یہ تو چند چھوٹی چھوٹی مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ اس طرح کی اور بہت سی خامیاں اور تضادات ان درجات کی نصابی کتابوں میں موجود ہیں۔ اسی لیے نصابی کتابوں کی کم سے کم ہر پانچ سال کے بعد تصحیح اور Update کرنے کی ضرورت ہے۔

□□□

College of Teacher Education
(Maulana Azad National Urdu University)
Kursu Rajbagh, Srinagar (J&K)

تحریر: اشوک گانگولی
ترجمہ: امتیاز عالم

لڑکیوں کی تعلیم

میں اس خیال کا زبردست حامی ہوں کہ عورتوں کو مردوں کے مساوی سہولیات حاصل ہونی چاہئیں اور جہاں ضروری ہو وہاں خصوصی سہولیات فراہم کی جائیں...... جیسا کہ مہاتما گاندھی نے ہندوستان کے ترقیاتی عمل کے ایک حصے کے طور پر لڑکیوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دینے کی پرزور سفارش کی تھی۔ وہ ایک صاحب بصیرت انسان تھے۔

وہ لڑکیوں اور عورتوں کی تعلیم کے لیے ایسے خصوصی انتظامات کے خواہاں تھے جن کی مدد سے زیادہ سے زیادہ لڑکیاں اور عورتیں با اختیار (Empowered) اور سماجی بندشوں سے آزاد ہوسکیں۔

اس فکر مندی کا اظہار جنسی مساوات کے فروغ کے لیے مناسب طریقے وضع کرنے کے لیے قائم کی گئی کمیٹیوں اور کمیشنوں کی سفارشات میں ہوا ہے۔ ہندوستان میں دستیاب اشاریے (Indicaters) اس بات کی واضح شہادت دیتے ہیں کہ لڑکیوں کے ساتھ ان کی پیدائش کے وقت سے ہی امتیاز برتا جاتا ہے اور اس کی مختلف وجوہات ہیں۔ اس کی وجہ سے یہ خیال عام طور پر لوگوں کے ذہن میں گھر کر گیا ہے کہ لڑکی کا وجود خاندان پر ایک بوجھ ہے۔ یہ سچ ہے کہ وقت بدل رہا ہے لیکن ملک کے دور دراز خطوں تک یہ پیغام پہنچانے کی ضرورت ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم پر مساوی بلکہ زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

جب میں 1970 کی دہائی میں علم طبیعیات میں پوسٹ گریجویشن کر رہا تھا تو اس زمانے میں عام طور سے یہ امید کی جا رہی تھی کہ بہت جلد سائنس اور انجینئرنگ کے شعبوں میں خواتین کی تعداد میں اضافہ ہونا چاہیے مگر تقریباً تیس سال سے زیادہ کا عرصہ گزرنے کے بعد بھی حالات جوں کے توں ہیں۔ اگر تارک مکتب طالب علموں کی شرح پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلے گا کہ اسکول کے اعلیٰ درجات میں لڑکیاں زیادہ ترک تعلیم کرتی ہیں۔ بہر حال اچھی بات یہ ہے کہ حالیہ رجحانات سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ لڑکیوں کے ترک تعلیم کی سطح میں گراوٹ آئی ہے۔ ملک کو اس مثبت رجحان کا فائدہ اٹھانا چاہیے اور لڑکیوں کی مدد اور حوصلہ افزائی (وظیفے یا انعام کی شکل میں) کے ذریعے اس کی رفتار کو مزید تیز کرنا چاہیے۔

اس تناظر میں تعلیم نسواں کے فروغ کے لیے حال ہی میں حکومت ہند کی جانب سے اعلان کردہ اقدامات اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ اقدامات اس حقیقت پر زور دیتے ہیں کہ ہندوستانی عورتوں کی طاقت میں اضافہ کرنے کے لیے محض خواندگی کافی نہیں ہے۔ ایک تکنیکی مرکوز سماج کے سرگرم ارکان کے طور پر مردوں اور عورتوں دونوں کو چند صلاحیتوں، مہارتوں اور علم سے لیس ہونا ہوگا تا کہ آج کی دنیا میں وہ موثر انداز میں شرکت کر سکیں۔ ایسا نتیجہ صرف اور صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب اسکولوں، یونیورسٹیوں اور پروفیشنل کالجوں میں اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لیے زیادہ سے زیادہ لڑکیوں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ مرکزی بورڈ برائے ثانوی تعلیم (CBSE) اور یو.جی.سی. نے لڑکیوں کو بااختیار بنانے کے لیے دو الگ الگ اسکیمیں تیار کی ہیں۔ ان اسکیموں کا تعلق یونیورسٹیوں، پروفیشنل اداروں اور ان سے آگے کی تعلیم کے لیے طالبات کو میرٹ اسکالرشپ مہیا کرانے سے ہے۔ ان اسکیموں میں ان لڑکیوں کو خصوصی درجہ دیا گیا ہے جو اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہیں۔ ایسی لڑکیوں (ماں باپ کی اکلوتی اولاد) کے لیے حال ہی میں ایک اور اسکیم کا اعلان کیا گیا ہے جس کے تحت دسویں جماعت میں 60 فیصد سے زیادہ نمبر حاصل کرنے والی تمام لڑکیوں کو گیارھویں اور بارھویں جماعت میں اسکالرشپ پیش کی جائے گی۔ یہ قابل تعریف اقدام ہے۔ اسکولوں سے فیس معاف کرنے کے لیے کہنے کی بجائے اپنے مستقبل کی تعمیر کی ذمہ داری اب خود ان طالبات پر ہے۔ ہمیں اب ضرورت ہے تمام خواہش مند شراکت داروں کے سرگرم تعاون کی۔ اس اقدام کی مدد سے ایسی لڑکیوں جو اپنی تعلیم کے لیے سنجیدہ ہیں، کو دسویں کے بعد اپنے پروفیشنل کورسوں/پوسٹ گریجویشن کے اختتام تک بغیر کسی مالی دشواری کے اپنی تعلیم جاری رکھنے کا موقع ملے گا۔

اس اسکیم کی کامیابی اور وسائل کی دستیابی کی صورت میں یہ سہولت پہلی

○ جناب اشوک گانگولی ممتاز ماہر تعلیم اور سینٹرل بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن، دہلی کے چیئرمین ہیں۔

جماعتوں میں بھی فراہم کرانے پر سنجیدگی سے غور کیا جارہا ہے۔

کیندریہ ودیالیوں نے چھٹی سے بارھویں جماعت تک کی ایسی لڑکیوں کی فیس پہلے ہی معاف کردی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ دوسرے تعلیمی ادارے بھی اس طرح کے اقدامات کریں گے تاکہ ہندوستان میں لڑکیوں کی تعلیم کے فروغ کے مواقع وسیع کرنے کے لیے نئے طریقے وضع کیے جاسکیں۔ کچھ لوگوں کا یہ خیال ہوسکتا ہے کہ یہ اقدامات لڑکیوں کو اسکول چھوڑنے سے روکنے کے لیے کیے جارہے ہیں۔ معاملہ یہ نہیں ہے۔ ان اقدامات کا بڑا مقصد ہے ملک میں بگڑے ہوئے جنسی تناسب کو ٹھیک کرنا۔ لڑکیوں کو سارنی رویوں کے ساتھ ساتھ جنس کی بنیاد پر ہونے والی ناانصافیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے زندگی میں ضروری مہارتوں سے لیس کرنے اور انھیں بااختیار بنانے کے لیے محض خواندگی کافی نہیں ہے۔

اس اسکیم سے متعلق یہ تشویش واجب ہے کہ یہ صرف اکلوتی لڑکی تک محدود ہے۔ اس سلسلے میں میرا جواب یہ ہے کہ ہر اقدام میں بہتری اور توسیع کے امکانات موجود ہوتے ہیں۔ ایک مخصوص ٹارگیٹ گروپ کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک اچھی اور متعدل شروعات کی گئی ہے۔ مستقبل میں یقیناً اس طرح کے مزید اقدامات کیے جائیں گے اور وہ ان نوجوانوں کو بااختیار بنانے میں اہم کردار ادا کریں گے جو معاشرے میں اپنے آپ کو حاشیے پر پاتے ہیں۔

(بشکریہ ''ٹائمس آف انڈیا'' نئی دہلی، 5 مئی 2006)

□□□

شعر، غیر شعر اور نثر

مصنف: شمس الرحمٰن فاروقی

جناب شمس الرحمٰن فاروقی کے خیال انگیز مضامین کا یہ مجموعہ پہلی بار 1973 اور دوسری بار 1998 میں شائع ہوا تھا۔ اس میں شامل مضامین نے تفہیم شعر و ادب کی نئی راہیں کھولیں۔ یہ اس اہم کتاب کا تازہ ترین ایڈیشن ہے جس میں ''پس نوشت: آج یہ کتاب'' کے عنوان سے ایک نئے مضمون کا اضافہ بھی کردیا گیا ہے۔ جدید ادب اور جدیدیت کی تفہیم نیز کلاسیکی ادب کی فہم و بازیافت دونوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

صفحات: 528، قیمت -/228 روپے

کلیات مصحفی (جلد اول تا چہارم)

مرتبہ: نثار احمد فاروقی

غلام ہمدانی مصحفی کا وطن امروہہ تھا لیکن ان کی زندگی کا بیشتر حصہ دہلی اور لکھنؤ میں گزرا اور ان دونوں بڑے ادبی مراکز سے کسب فیض کرکے انھوں نے ایک نیا رنگ فن ایجاد کیا جو ان کی پہچان بنا۔ مصحفی بڑے پرگو شاعر تھے۔ جناب نثار احمد فاروقی نے جو مصحفی کے ہم وطن بھی تھے ان کی کلیات آٹھ جلدوں میں مرتب کردیا ہے، جن میں سے چار شائع ہوچکے ہیں۔

جلد اول۔ صفحات: 495، قیمت: -/220
جلد دوم۔ صفحات: 369، قیمت: -/154
جلد سوم۔ صفحات: 320، قیمت: -/181
جلد چہارم۔ صفحات: 369، قیمت: -/216

توبۃ النصوح

مصنف: ڈپٹی نذیر احمد

''توبۃ النصوح'' اردو کے پہلے ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد کا تیسرا ناول ہے جو پہلی بار 1877 میں شائع ہوا۔ اصلاح معاشرہ کے مقصد سے لکھے گئے اس ناول کو کلاسک کا درجہ حاصل ہے اور یہ ملک کی تمام یونیورسٹیوں اور کالجوں کے نصاب میں شامل ہے۔ ناول کا یہ ایڈیشن اتر پردیش اردو اکادمی کے 1983 میں شائع کردہ نسخے پر مبنی ہے۔

صفحات: 175، قیمت: -/75 روپے

ابن الوقت

مصنف: ڈپٹی نذیر احمد

ڈپٹی نذیر احمد نے اس ناول میں انگریزی تہذیب کی اندھی تقلید اور اس سے پیدا ہونے والی خرابیوں کو موضوع بنایا ہے۔ ابن الوقت، نوبل صاحب اور حجۃ الاسلام کے کرداروں کی مدد سے ناول نگار نے انیسویں صدی کے ہندوستانی مسلم معاشرے کی عکاسی کی ہے جو اس عبوری دور سے گزر رہا تھا۔ ناول کا متن اتر پردیش اردو اکادمی کے 1973 میں شائع کردہ متن پر مبنی ہے۔

صفحات: 225، قیمت: -/91 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45% اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر.کے. پورم، نئی دہلی-110066

تحریر: وِدوھا کول
ترجمہ: فیروز عالم

وہ بچپنے کی نیند تو اب خواب ہوگئی

اس کے دن کا آغاز صبح پانچ بجے اور اختتام رات کے ایک بجے ہوتا ہے۔ اس درمیان صرف ایک گھنٹہ ہے جسے وہ اپنا کہہ سکتا ہے۔ وہ کوئی مشہور سیاست داں یا بے حد مصروف تاجر نہیں، اسکول جانے والا ایک 13 سالہ طالب علم ہے۔ آکاش تھسو اپنے عہد کا ایک ایسا لڑکا ہے جو کبھی پوری نیند نہیں سو پاتا۔ اسے سونے کے لیے صرف چار گھنٹے ملتے ہیں بقیہ 20 گھنٹے اسکول، کرکٹ، ساس بہو والا سیریل، نیٹ سرفنگ، موبائل فون پر بات کرنے اور ٹیوشن کی نذر ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات اسے اسکول میں نیند آتی ہے۔ اس کی ماں نمی تھسو کہتی ہیں "آج وہ اسکول نہیں جانا چاہتا تھا۔ یہ ہے ہماری روزمرہ زندگی کا ڈھرا جس پر ہم چل رہے ہیں۔ اس کو پڑھنے اور کھیلنے کے علاوہ ٹی.وی. بھی دیکھنا ہے، کمپیوٹر اور فون بھی اس کی توجہ اپنی جانب مرکوز کرتے ہیں۔"

[illegible]

یہ معاملہ صرف آکاش کا نہیں ہے۔ ماں باپ دونوں برسر روزگار، چوبیسوں گھنٹے ٹیلی ویژن، انٹرنیٹ تک آسان رسائی، موبائل فون کی روز افزوں تعداد، کھیل اور مختلف قسم کے شوق نے بہت سے بچوں کی ترجیحات کی فہرست میں سونے کو آخری ترجیح بنا دیا ہے۔ سونے کا وقت جہاں رات میں آگے کھسکتا جا رہا ہے وہیں اسکول کا وقت وہی ہے جس کی وجہ سے بہت سے بچوں کو معمول کے مطابق اوسطاً آٹھ گھنٹے سونے کا وقت نہیں مل رہا ہے جو ان کی صحت مند نشوونما کے لیے لازمی ہے۔

دہلی کے صفدر جنگ اسپتال کے ڈاکٹر جے.سی. سوری کا خیال ہے کہ "جوانوں کی بہ نسبت بچوں کے لیے سونا زیادہ ضروری ہے کیونکہ نیند کے دوران ہی زیادہ تر نشوونما والے ہارمون جاری ہوتے ہیں۔ معمول سے کم سونے سے بچے کی مجموعی نشوونما پر برا اثر پڑتا ہے۔ آج بہت سے بچوں کو خاطر خواہ سونے کا وقت نہیں ملتا جس کا اثر یہ ہو رہا ہے کہ ان کے مزاج میں چڑچڑاپن بڑھ رہا ہے، انہماک اور توجہ میں کمی آ رہی ہے اور اسکول میں ان کی کارگزاری متاثر ہو رہی ہے۔"

ایک حالیہ بین الاقوامی مطالعے میں پایا گیا کہ کم سونے کی وجہ سے قوت انہماک اور یادداشت کے مسائل کے علاوہ بچوں میں موٹاپا بھی خطرناک حد تک بڑھ رہا ہے۔ کینیڈا کی لیول (Laval) یونیورسٹی میں کیے گئے ایک مطالعے میں پایا گیا کہ ضرورت سے کم سونے والے بچوں میں خاطر خواہ سونے والے بچوں کی بہ نسبت موٹاپے کا خطرہ ساڑھے تین گنا ہے۔

بچوں کے رویے میں آنے والی تبدیلیاں بھی باعث تشویش ہیں۔ فورٹیس اسپتال کے ڈاکٹر آر.کے. منی کے مطابق "ہر وقت تھکاوٹ (کام کرنے یا مصروف رہنے کی وجہ سے) بدمزاجی، غصہ اور ہیجان کا سبب بنتی ہے۔ بہت سے بچے مبہم سے درد کی شکایت کرتے ہیں، جانچ کے بعد پتہ چلتا ہے کہ اس کی وجہ ان کا ٹھیک سے نہ سونا ہے۔"

کیرین بکراسی اور ان کے شوہر ڈاکٹر ہیں۔ ان کے دو بچے ہیں جو درجہ پنجم اور ہفتم کے طالب علم ہیں۔ بکراسی بتاتی ہیں۔ "ہم لوگ بچپن میں آٹھ ساڑھے آٹھ بجے رات تک سو جاتے تھے لیکن میرے بچے ایسا کبھی نہیں کرتے۔ اختتام ہفتہ (سنیچر اور اتوار) اور دیگر چھٹیوں میں وہ آدھی رات سے پہلے نہیں سوتے۔ رات میں زیادہ وقت وہ فلم دیکھنے یا Play Station میں گزارتے ہیں ورنہ دوستوں کے ساتھ رہتے ہیں یا ہم لوگوں کے ساتھ باہر جاتے ہیں۔

- ایک اسکول جانے والے بچے کے لیے مسلسل آٹھ گھنٹے سونا ضروری ہے۔
- لگاتار سونا جوانوں کی بہ نسبت بچوں کے لیے زیادہ ضروری ہے کیوں کہ نشوونما والے زیادہ تر ہارمون رات میں ہی جاری ہوتے ہیں۔
- گہری نیند جسمانی تھکاوٹ دور کرتی ہے اور یادداشت بہتر ہوتی ہے۔اس لیے اگر کوئی بچہ دیر سے سوتا ہے اور جلدی بیدار ہوتا ہے تو اس کی یادداشت متاثر ہوتی ہے۔
- بہت دنوں تک نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے انہماک میں کمی، تاخیر سے جواب، مستعدی میں کمی، بہت دیر تک توجہ مرکوز نہ رکھ پانا، تھکاوٹ اور چڑچڑاپن کے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔
- اس کی وجہ سے مایوسی (Depression) طاری ہوتی ہے۔ بچپن کا ڈپریشن آج پہلے سے بہت زیادہ عام ہے۔

کم سونے یا ٹھیک سے نہ سونے کی وجہ سے بچوں کے برتاؤ سے متعلق مسائل پر تبصرہ کرتے ہوئے راک لینڈ اسپتال کے ڈاکٹر سنجیو بگائی کہتے ہیں: ''آج کل بچے زیادہ تر بیٹھے رہتے ہیں اس لیے انھیں اتنی تھکن کا احساس نہیں ہوتا کہ وہ رات میں سوسکیں لیکن دن میں اونگھتے رہتے ہیں۔''

سی.آر.پی.ایف. اسکول کے پرنسپل سوریہ پرکاش اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ ان کے اسکول میں ایسے لاتعداد بچے ہیں۔ ''ہم لوگ دیکھتے ہیں کہ بچے کلاس میں اونگھتے رہتے ہیں یا خالی نظروں سے تختۂ سیاہ (Black Board) پر ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہتے ہیں۔''

شادیوں کے موسم میں یہ اور زیادہ عام ہے۔ وہ مزید بتاتے ہیں: ''جن گھروں میں ماں اور باپ دونوں نوکری کرتے ہیں وہاں ٹیلی ویژن بچوں کے لیے Baby Sitter ہوگیا ہے۔ کارٹون دیکھنا اور کھانا کھانا۔ لوگوں کی آمدنی میں جیسے جیسے اضافہ ہو رہا ہے، ہفتے کی تعطیلات کے علاوہ بھی باہر کھانے کا رواج زور پکڑتا جارہا ہے۔ اس کی وجہ سے بھی بچے دیر سے بستر پر جاتے ہیں۔ اسکول کے اوقات میں تبدیلی نہیں ہوسکتی اس لیے ضروری ہے کہ والدین اپنے طرز زندگی میں تبدیلی لائیں۔ اگر اس پر ابھی توجہ نہ دی گئی تو بچے جب بڑے ہوں گے تو نیند کی کمی سے دوچار ہوں گے۔

ڈاکٹر سنجیو بگائی بتاتے ہیں کہ ''تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ یہ ہائپرٹنشن (خون کا غیر معمولی دباؤ) اور جراثیم کے حملے سے مدافعت کی صلاحیت میں کمی کا باعث ہو رہا ہے جس کی وجہ سے بچے آسانی سے وائرل انفکشن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ایسے بچوں میں (جو نیند کی کمی اور موٹاپے کا شکار ہیں) کولیسٹرول کی زیادتی، ذیابیطس اور گھٹنے کے جوڑوں میں درد کی شکایات بڑھ رہی ہیں۔

دوپہر کا قیلولہ بھلے ہی بچوں کے لیے مفید ہوتا ہے لیکن یہ رات میں سونے کی تلافی نہیں کرسکتا۔ ڈاکٹر منی کے مطابق ''دو مرحلوں یعنی چار گھنٹہ رات میں اور چار گھنٹہ صبح سونا اور رات میں لگاتار آٹھ گھنٹہ سونا، دونوں یکساں نہیں ہوسکتے۔''

سونا دو مرحلوں میں منقسم ہے۔ آر.ای.ایم. (Rapid Eye Movement Sleep) اور نان آر.ای.ایم. (Non REM) نان آر.ای.ایم. چار مراحل میں منقسم ہے جس میں آخری دو کا تعلق گہری نیند سے ہے۔

انسان گہری نیند میں ہی جسمانی تھکاوٹ سے نجات پاتا ہے۔ گہری نیند سونے کے ابتدائی ایک تہائی حصے میں ہی آتی ہے جب کہ آر.ای.ایم. نیند آخری ایک تہائی حصے میں آتی ہے۔ اس لیے ڈاکٹر سوری کے لفظوں میں ''آپ کا بچہ رات میں دیر سے سوتا ہے یا صبح بہت پہلے بیدار ہو جاتا ہے اس کے بدن کو نقصان پہنچتا ہے، خواہ وہ جسمانی ہو یا ذہنی۔''

(بشکریہ ''ٹائمس آف انڈیا'' نئی دہلی، 27 اپریل 2006)

□□□

حیات جاوید

مصنف: الطاف حسین حالی

مولانا الطاف حسین حالی نہ صرف ایک رجحان ساز شاعر اور نقاد تھے بلکہ انھوں نے سوانح نگاری میں بھی اپنا لوہا منوایا اور ''حیات سعدی''، ''یادگار غالب'' اور ''حیات جاوید'' جیسی کتابیں یادگار چھوڑیں۔ ''حیات جاوید'' میں حالی نے سرسید کی زندگی کے حالات، افکار اور خیالات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کتاب کی اہمیت یوں بھی ہے کہ حالی سرسید سے بے حد قریب تھے اور سرسید نے ملک وقوم کی جو خدمت کی اس کے عینی شاہد۔

پانچواں ایڈیشن، صفحات: 907، قیمت: -/181 روپے

کلیات چودھری محمد علی ردولوی (تین جلدوں میں)

ترتیب وتدوین: مسعود الحق

چودھری محمد علی ردولوی اپنے زمانے کے ایک روشن خیال اور شگفتہ نگار ادیب تھے۔ ان کا تعلق انیسویں صدی کے ادیبوں کی اس نسل سے تھا جس میں ولایت علی بمبوق، سجاد حیدر یلدرم، پریم چند، مولانا ابوالکلام آزاد اور نیاز فتحپوری وغیرہ شامل تھے۔ اس کلیات میں ان کی تمام تحریریں جمع کردی گئی ہیں۔

جلد اوّل، صفحات: 344، قیمت: -/172 روپے
جلد دوم، صفحات: 455، قیمت: -/172 روپے
جلد اوّل، صفحات: 450، قیمت: -/172 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45% اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی- 066 110

رضاء الرحمن عاکف

اردو طباعت کا سفر

اردو زبان اگرچہ برصغیر ہند و پاک کی مقبول عام زبان رہی ہے۔ مگر بدقسمتی سے اس کی طباعت ایک مدت تک زبردست مسئلہ بنی رہی۔ اس کی اصل وجہ دراصل اس زبان کی طرز تحریر ہے جس میں متعدد حروف کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں جو ملا کر لکھے جانے کے وقت بدلتی رہتی ہیں۔ اسی وجہ سے اس کی کاپی نویسی کا سب سے عمدہ اور کارگر طریقہ ہاتھ سے لکھا جاتا رہا ہے۔ جسے اصطلاح میں کتابت، خوش نویسی یا کاپی نویسی کہا جاتا ہے۔ سیسے اور لوہے کے حروف کو ملا کر چھاپنے کا طریقہ ایجاد ہونے پر ہندی اور انگریزی جیسی زبانوں کی طباعت کا مسئلہ تو کسی حد تک حل ہو گیا اور ان زبانوں کی کتابیں ٹائپ میں شائع ہو کر بازار میں آنا شروع ہو گئیں مگر اردو والوں کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا اور انھیں روایتی اور قدیم طرز کی کاپی نویسی سے ہی کام چلانا پڑا۔ نتیجتاً اردو کتابوں کی طباعت میں صرفہ بھی زیادہ ہوتا ہے اور وہ بازار میں بھی دیر سے پہنچتی تھیں۔

اردو سے وابستہ کچھ افراد نے ان مسائل کو حل کرنے کے لیے سنجیدہ کوششیں کیں اور ہندی انگریزی کی طرز پر اردو حروف کو بھی ٹائپ میں ڈھالنے کی کوشش کی مگر انھیں اس سلسلے میں خاطر خواہ کامیابی نہ مل سکی۔

1800 میں جب فورٹ ولیم کالج کی کتابوں کی طباعت کا مسئلہ درپیش ہوا تو اسی کالج کے تحت ایک مطبع بھی قائم ہوا لیکن 25-1820 میں جب یہ کالج بند ہوا تو یہ مطبع بھی ختم ہو گیا۔ 1825 میں والیِ اودھ نواب وصی الدین خاں نے ایک انگریز ماہر کی نگرانی میں فیض آباد میں ٹائپ کا ایک چھاپہ خانہ قائم کیا مگر اس کی چھپی ہوئی کتابیں مقبول نہ ہو سکیں جس کی وجہ اس ٹائپ کا طرز نستعلیق نہ ہونا تھا۔ 1841 میں کچھ اردو خواں انگریز حضرات نے اس خامی کو مدنظر رکھتے ہوئے نستعلیق کا ٹائپ بنانے کی کوشش کی مگر وہ بھی اس سلسلے میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکے۔ سرسید احمد خاں کے بعد غازی پور میں ایک مطبع قائم ہوا اور اس کے لیے ایک ٹائپ تیار کیا گیا۔ لیکن یہ بھی بہت حد تک نسخ سے مشابہ تھا۔ اور اس میں حروف ٹوٹے ہوئے رہتے تھے۔ لہٰذا اسے بھی کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ اور یہ تقریباً 35 سال بعد دم توڑ گیا۔ غالباً 1920 میں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے ریاست حیدرآباد دکن کی زیر سرپرستی نستعلیق ٹائپ بنوایا اور ایک کتاب ''رانی کیتکی کی کہانی'' بطور نمونہ طبع کرائی۔ گو کہ یہ ٹائپ پسند کیا گیا مگر دوام حاصل نہ کر سکا۔

روزنامہ ''ڈان'' نے اردو داں طبقے میں اردو ٹائپ کو مقبول بنانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اردو داں طبقے کو ٹائپ میں چھپی ہوئی تحریر پڑھنے کا عادی بنانے کے لیے بعض اردو اخبارات نے چند کالم ٹائپ میں چھاپنے شروع کیے لیکن ان کی یہ کوشش بھی کارگر نہ ہو سکی۔ دراصل اردو ٹائپ کی مذکورہ بالا تمام کوششوں کی ناکامی کا اصل سبب یہ تھا کہ اردو داں طبقے کو ہمیشہ سے ہی اردو نستعلیق سے کچھ زیادہ ہی لگاؤ رہا ہے۔ دراصل نستعلیق سے اردو کا پیدائشی رشتہ ہے اور نستعلیق میں لکھی ہوئی تحریر ہی اردو تحریر معلوم ہوتی ہے۔ نسخ یا دیگر طرز پر لکھی ہوئی عبارت پر عربی میں حروف کو ملا کر لکھنا ایک بڑا پریشان کن مسئلہ رہا ہے کیوں کہ دوسری زبانوں کے مقابلے اردو میں ایک ایک حرف کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں اور جوڑ اور پیوند کے مطابق ان کی ہیئت بدلتی رہتی ہے۔ جبکہ انگریزی، ہندی یا اسی طرح کی دوسری زبانوں کے ٹائپ تیار کرنے میں یہ سہولت رہی کہ ان کے حروف کی شکل میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

عصر حاضر میں چھپائی کے آفسیٹ طریقے نے ایک خاص مقام حاصل کیا مگر اردو میں کتابت یا کاپی نویسی کا مسئلہ بدستور قائم رہا بلکہ اردو کتابت کی سست رفتاری نے اس جدید ترین طریقۂ طباعت کی افادیت کو بھی پوری طرح ضائع کر دیا اور اب اردو میں اس کے روایتی حسن کے ساتھ جدید طرز پر کاپی نویسی کی ضرورت اور بھی شدت کے ساتھ محسوس کی جانے لگی۔ بڑی محنت، لگن اور کوشش کے بعد اس عہد میں اتنا ضرور ہوا کہ فوٹو کے ذریعے ٹائپ کے جوڑ ملانے کا طریقہ ایجاد ہوا جس کو لیزر ٹائپنگ کا نام دیا گیا۔ اس سے جوڑ ملانے کی مشکل تو کسی حد تک آسان ہو گئی مگر نشستوں کی الجھن اب بھی برقرار رہی۔ نیز سانچوں کی کثیر تعداد کا بھی کوئی حل نہ نکل سکا۔

احمد مرزا جمیل نے اردو کاپی نویسی کے میدان میں حروف کو باہم جوڑنے کی ایک نئی ترکیب وضع کر کے ایک بڑی کامیابی حاصل کی۔ اس کے ذریعے اردو کاپی نویسی میں کمپیوٹر کا استعمال ممکن ہو گیا۔

انھوں نے اپنی اس ایجاد کا نام ''نوری نستعلیق'' رکھا۔ 1980 میں احمد مرزا جمیل نے اپنی یہ ایجاد برطانوی ادارہ ''مولو ٹائپ کارپوریشن'' کو پیش کی تو اس کمپنی نے اس ایجاد کو سند قبولیت عطا کر دی اور اس کو اپنے ''لیزر کومپ ٹائپ سیٹنگ مشین'' میں استعمال کرنے پر رضامندی ظاہر کی۔ اب اس ایجاد کے ذریعے اردو کو اس کے روایتی خط نستعلیق میں بذریعہ کمپیوٹر تحریر کرنا ممکن ہو گیا ہے۔ اس کی افادیت کو تسلیم کرتے ہوئے جمیل احمد نقوی نے اپنے مضمون ''سیسے کے حروف سے الیکٹرانک خطاطی تک'' میں اس طریقۂ کتابت یا کاپی نویسی کا تعارف اس طرح کرایا۔ ''جب الیکٹرانک طریق کار کے طباعت کے میدان میں داخل ہو جانے کی وجہ سے حالات بہتر ہو گئے تو جناب مرزا جمیل اور مطلوب الحسن نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مزید کامیابی کے لیے غور کرنا شروع کیا۔ ابھی وہ اس سلسلے میں کوئی بھی پیش رفت نہ کر سکے تھے کہ لیزر شعاعوں کا استعمال ممکن ہو گیا جس کے ذریعہ حروف و الفاظ کے عکس اتارنے کی بجائے پوری عبارت کی ہی تصویر نہایت سرعت کے ساتھ اتاری جا سکتی تھی۔ ان دونوں حضرات نے محسوس کیا کہ اس طریقے کو بروئے کار لاتے ہوئے نستعلیق میں اردو زبان کی بہ آسانی کتابت کی جا سکتی ہے اور اس طرح انھوں نے کمپیوٹر پر اردو نستعلیق کی کتابت کو ممکن بنا کر اردو کاپی نویسی کے ایک بہت بڑے مسئلے کو حل کر دیا۔ اور اس طرح اردو زبان کی کاپی نویسی یا کتابت کو اب بہ آسانی خوبصورت انداز میں اور نہایت سرعت کے ساتھ کرنا ممکن ہو گیا۔''

آج اس طریقۂ کاپی نویسی کو بہت زیادہ فروغ حاصل ہو رہا ہے اور اردو اخبارات، رسائل اور کتابوں کو اب نہایت قلیل مدت میں آسانی سے کمپیوٹرائز کتابت کے ذریعے بہت ہی خوبصورت انداز میں طبع کرایا جا رہا ہے۔ اس وقت کمپیوٹر کی دنیا سے وابستہ بہت سی کمپنیاں اردو سافٹ ویئر کے اعلیٰ ترین نمونے تیار کر رہی ہیں۔ ان میں ''ان پیج'' اور ''کاتب'' سرفہرست ہیں۔ احمد مرزا جمیل اور مطلوب الحسن پوری اردو دنیا کی طرف سے شکریے کے مستحق ہیں۔ جن کی اس مشترکہ ایجاد نے اردو کتابت و طباعت کو دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے برابر لا کھڑا کیا۔

□□□

Mohalla Miyan Sarai
P.O. : Sambhal
Distt. : Moradabad-244302 (U.P.)

خطبات آزادی (حصہ اول)

1921 سے 1946 کے درمیان کانگریس کے 17 اہم جلسے ہوئے جن کی صدارت حکیم اجمل خاں سی. آر. داس، محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، مہاتما گاندھی، سروجنی نائیڈو، مختار احمد انصاری، موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو اور سبھاش چندر بوس جیسے قومی رہنماؤں نے کی۔ اس کتاب میں آزادی سے قبل کانگریس کے جلسوں میں پیش کیے گئے تمام صدارتی خطبے جمع کر دیے گئے ہیں۔

صفحات: 580، قیمت -/280 روپے

ڈیوڈ کاپرفیلڈ (جلد اول)

مصنف: چارلس ڈکنس

مترجم: فضل حسنین

انگریزی کے عظیم ناول نگار چارلس ڈکنس کے ناول ڈیوڈ کاپرفیلڈ کو عالمی کلاسک کا درجہ حاصل ہے۔ اردو میں پہلی بار اس کا ترجمہ شائع کرنے کا شرف کونسل کو حاصل ہے۔ مترجم نے بے حد سادہ اور عام فہم زبان میں اس ناول کو اردو کا قالب عطا کیا ہے۔

صفحات: 516، قیمت :-/256 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45% اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔
تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-066 110

تحریر: ایم.ایس.سوامی ناتھن
ترجمہ: خان شاہد وہاب

مشن 2007
ہر گاؤں ایک معلوماتی مرکز

15اگست 2007تک ہندوستان کے ہر گاؤں میں معلومات کی فراہمی یقینی بنانے کے لیے متعدد جاری اور نئے پروگراموں کے درمیان ارتکاز اور اشتراک کی ضرورت ہے۔ سبز انقلاب نے جہاں چاول، گیہوں اور دیگر غلّوں کی پیداوار اور پیداواری صلاحیت میں بہتری لانے میں مدد کی، اُسی طرح اطلاعاتی انقلاب انسانی کارکردگی اور کاروبار کے اضافے میں معاون ہوگا۔

گذشتہ برس نومبر میں تیونس (Tunis) میں منعقدہ اطلاعاتی سماج پر عالمی اجلاس (WSIS, The World Summit on Information Society) میں ساری دنیا کو 2015 تک ایک دوسرے سے جوڑ دو کے نام سے ایک پروگرام شروع کیا گیا۔ اس کا مقصد اس امر کو یقینی بنانا ہے کہ ڈجیٹل انقلاب کے ثمرات تمام ممالک اور ہر ملک کے سبھی حصوں میں 2015 تک پہنچ سکیں۔ 2015 کو اقوام متحدہ ہزارہ (Millenium) ترقی حاصل کرنے کے سال کے طور پر مختص کیا گیا ہے۔ 15 نومبر 2005 کو تیونس میں ہونے والی ایک تقریب میں بین الاقوامی ٹیلی مواصلاتی یونین نے ہندوستان کے "مشن 2007: ہر گاؤں— ایک معلوماتی مرکز" کو دنیا کو جوڑ دو تحریک کے طور پر تسلیم کیا۔

مشن 2007 کا مقصد ہندوستان کے ہر گاؤں کو 15 اگست 2007 تک معلومات کی مربوط فراہمی ہے۔ 15 اگست 2007، اس تاریخ ساز واقعے کی ساٹھویں سال گرہ ہے جسے پنڈت جواہر لال نہرو نے 'ہندوستان کی مقدر سے ملاقات' (Indus tryst with destiny) سے موسوم کیا تھا۔

2003 میں قومی اتحاد برائے مشن 2007 کا قیام عمل میں آیا جس کا مقصد کثیر الجہتی شراکت کے لیے ایک پلیٹ فارم مہیا کرنا تھا۔ بظاہر ناممکن نظر آنے والے نشانے (Goals) شراکت کی قوت کو بروئے کار لاکر حاصل کیے جا سکتے ہیں کیونکہ کسی اتحاد کے شراکت داروں کی انفرادی قوت خواہ کچھ بھی ہو لیکن ان کی مشترکہ قوت بہر حال قابل قدر ہوتی ہے۔

قومی اتحاد برائے مشن 2007 میں فی الوقت 22 سرکاری ادارے شامل ہیں جن میں محکمۂ اطلاعاتی ٹیکنالوجی، پنچایتی راج کی وزارت، ٹیلی کم ریگولیٹری اتھارٹی آف انڈیا (TRAI)، بھارت سنچار نگم لمیٹیڈ (BSNL) اہم ہیں۔ اس اتحاد میں شہری سوسائٹی سے وابستہ 94 ادارے اور NASSCOM، TCS، HCL اور مائیکرو سافٹ ویئر سمیت اطلاعات و مواصلات کے 34 سرکردہ نجی ادارے شامل ہیں۔ ان کے علاوہ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی اور اندرا گاندھی اوپن یونیورسٹی سمیت 18 تعلیمی ادارے اور قومی بینک برائے زراعت اور دیہی ترقی (NABARD) اور اسٹیٹ بینک آف انڈیا سمیت دس مالیاتی ادارے بھی اس اتحاد میں شامل ہیں۔

اس کے علاوہ ایک بین الاقوامی امدادی گروپ بھی تشکیل دیا گیا ہے جو مشن 2007 کو تکنیکی اور مالیاتی امداد فراہم کرے گا۔ اقوام متحدہ ترقیاتی پروگرام کے رہائشی نمائندے (Resident Representative) اس گروپ کے صدر ہیں۔ اس گروپ میں مندرجۂ ذیل اداروں کی فعال شراکت ہے:

بین الاقوامی مرکز ترقی و تحقیق کینیڈا، بین الاقوامی ترقیاتی ایجنسی، سوئٹزرلینڈ کی ایجنسی برائے ترقی اور تعاون، برطانوی محکمہ برائے بین الاقوامی ترقی، عالمی بینک، نیم ریگستانی علاقے کے لیے بین الاقوامی تحقیقی انسٹی ٹیوٹ برائے فصل، یونیسکو، عالمی تنظیم صحت، تنظیم برائے خوراک و زراعت، عالمی خوراک پروگرام، بین الاقوامی فنڈ برائے زراعتی ترقی، میک آرتھر فاؤنڈیشن، جھائی فاؤنڈیشن (Jhai Foundation) اور گلوبل نالج پارٹنرشپ۔

دو سال قبل مشن 2007 کے آغاز اور قومی کمیشن برائے کاشت کار (National Commission for Farmers) کی اس سفارش کے بعد کہ دیہی خاندانوں کو معلومات اور ہنر فراہم کرنے کی غرض سے دیہی معلوماتی مراکز (VKCs, Village Knowledge Centres) جتنی جلد ممکن ہو سکے قائم کیے جائیں، اس سلسلے میں قابل ذکر پیش رفت ہوئی ہے جس سے یہ امید بندھی ہے کہ 15 اگست 2007 تک شہری اور دیہی علاقوں کے مابین ڈجیٹل خلیج کو کافی حد تک ختم کیا جا سکے گا۔ اس پیش رفت کے نمایاں

پہلو مندرجہ ذیل ہیں۔

15 اگست 2007 تک محکمۂ اطلاعاتی ٹیکنالوجی، حکومتِ ہند، کی جانب سے اطلاعاتی اور مواصلاتی ٹیکنالوجی پر مبنی ایک لاکھ کمیونٹی خدمات مراکز کے قیام کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ریاست گیر ایریا نیٹ ورک (State Wide Area Network، SWAN) ڈھانچے کی کارکردگی میں اضافہ کرتے ہوئے، یہ کمیونٹی خدمات مراکز دور دراز کے دیہات کو قابل اعتماد اور وسیع بنیادی رابطے فراہم کریں گے۔

بھارتی خلائی تحقیقی تنظیم (ISRO) مناسب پرائیویٹ اور شہری، حقوق کے اداروں کے ساتھ اشتراک کر کے بلاک کی سطح پر دیہی وسائل مراکز قائم کرے گا تا کہ ٹیلی کانفرنسنگ کی سہولیات سمیت وسیع پیمانے پر مختلف خدمات فراہم کی جا سکیں۔

پنچایتی راج کی وزارت کا یہ فیصلہ کہ 15 اگست 2007 تک ملک کے سبھی دو لاکھ چالیس ہزار (2,40,000) پنچایتوں اور بلدیات (میونسپلٹیوں) میں انٹرنیٹ سے وابستہ اطلاعاتی اور مواصلاتی ٹیکنالوجی مراکز قائم کیے جائیں گے۔ اس سے دیہی معاشرے کے ہر طبقے کی رسائی دیہی معلوماتی مراکز تک قائم ہو سکے گی۔

بھارت سنچار نگم لمیٹیڈ (BSNL) کا دیہی اطلاعاتی سوسائٹی قائم کرنے کا اقدام جس کا مقصد دو ہزار یا اس سے زیادہ کی آبادی پر ایک دیہی معلوماتی مرکز کا قیام ہے۔ BSNL ایسے ایک لاکھ مراکز قائم کرے گا۔

قومی بینک برائے زراعت اور دیہی ترقی (NABARD) کا ریاستی سرکار کو دیہی بنیادی ڈھانچہ ترقی فنڈ کے ذریعے اطلاعاتی و مواصلاتی ٹیکنالوجی پر مبنی خود امدادی گروپ (Self Help Group) کے قیام میں تعاون۔ یہ گروپ دیہی معلوماتی مراکز قائم کریں گے اور ان کا نظم و نسق سنبھالیں گے۔

ای. گورننس (e-governance) کے فروغ کو قومی کم از کم مشترکہ پروگرام کا ایک کلیدی حصہ بنانا اور معلومات کی ترسیل کو 'بھارت نرمان پروگرام' کا ایک لازمی حصہ بنانے کی تجویز۔

ہمہ گیر خدمات کی فراہمی کے لیے مختص فنڈ سے پبلک ٹیلی اطلاعاتی مراکز کا قیام۔

وزارت صحت اور خاندانی بہبود کے قومی دیہی صحت مشن میں ای. صحت سہولیات کی شمولیت۔

قانون حق اطلاعات (2005) کا نفاذ:

یہاں پر اس امر کو یقینی بنانے کی ضرورت ہے کہ دیہی اور قبائلی خاندانوں کی امداد کے لیے کیے جانے والے ایسے تمام اقدامات کے خاکے اور عمل درآمد دونوں کو غریبوں، عورتوں اور روزگار فراہمی کے موافق ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ اس ضمن میں مرکز اور ریاستوں دونوں نے متعدد دیگر اقدامات کیے ہیں۔ علاوہ ازیں نجی صنعت، تعلیمی اور شہری سوسائٹی ادارے بھی شہر اور دیہات کے درمیان واقع ڈیجیٹل خلیج کو پر کرنے میں سرگرم ہیں اور یہ ادارے صحت، روزگار، خوراک، پانی اور آمدنی کی ضمانت جیسے شعبوں سے متعلق معلومات تک رسائی کے معاملے میں دیہی خاندانوں کو فراہم کر رہے ہیں۔ نجی شعبے نے بھی اس ضمن میں کئی قابل ذکر اقدامات کیے ہیں، مثلاً ITC کا ای. چوپال پروگرام اور مائیکروسافٹ کا غیر محدود امکانی صلاحیت کو بروئے کار لانے کا پروگرام۔

یہ امر واضح ہے کہ اگر ہم متعدد جاری اور نئے پروگراموں کے درمیان ارتکاز اور اشتراک قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو 15 اگست 2007 تک اطلاعاتی انقلاب کا ہدف حاصل کرنے کا خواب حقیقت بن سکتا ہے۔ سبز انقلاب نے جہاں چاول، گیہوں اور دیگر اناجوں کی پیداوار اور پیداواری صلاحیت میں بہتری لانے کے سلسلے میں ہماری مدد کی تھی۔ اسی طرح اطلاعاتی انقلاب ہر شعبۂ حیات میں انسانی کارکردگی اور کاروبار کے اضافے میں معاون ہوگا۔

دیہی مرکز برائے معلومات کا بنیادی مقصد انٹرنیٹ، کیبل ٹیلی ویژن، موبائل فون، چوپال ریڈیو اور مقامی پریس کا مربوط اور مناسب استعمال ہے۔ ابتدا میں دو لاکھ چالیس ہزار (2,40,000) پنچایتوں اور میونسپلٹیوں میں دیہی مراکز معلومات قائم کیے جائیں گے۔ لاؤڈ اسپیکروں اور ایف. ایم. ریڈیو کی مدد سے یہ مراکز ملک کے سبھی چھ لاکھ گاؤں کو اپنے دائرۂ کار میں لے آئیں گے۔ انٹرنیٹ کمیونٹی ریڈیو اور موبائل فون کمیونٹی ریڈیو دور دراز کے علاقوں میں بروقت اطلاعات پہنچانے کے مؤثر ذرائع ہیں۔ زرعی اشیا کی بازار میں قیمت کی نگرانی موبائل فون پر کی جا سکتی ہے اور کم قوت کے ایف. ایم. ریڈیو کے ذریعے ان قیمتوں سے متعلق جانکاری مختلف گاؤں میں پہنچائی جا سکتی ہے۔ دیہی معلومات مراکز پر مشتمل ایک گروپ کی معاونت کے لیے بلاک کی سطح پر ایک مرکزِ دیہی وسائل ہوگا جہاں ٹیلی کانفرنسنگ کی سہولیات بھی دستیاب ہوں گی۔

مقامی آبادی میں احساس ملکیت کے ساتھ ساتھ دیہی مراکزِ معلومات کی کامیابی کے لیے دیگر اہم شرائط کا تعلق مواصلات، اطلاعاتی مواد اور صلاحیتوں کی نشوونما جیسے شعبے سے ہے۔ خوش قسمتی سے پورے ملک میں چھ

لاکھ ستر ہزار (6,70,000) کلومیٹر سے زائد پر مشتمل زیر زمین فائر آپٹک کیبل نیٹ ورک کی وجہ سے 85 فیصد گاؤں کو ایک دوسرے سے مربوط کیا جاسکتا ہے۔

دیہی خاندان دیہی اطلاعاتی مراکز میں کس قدر دلچسپی لیں گے۔ ان اطلاعاتی مواد کو مانگ (Demand) سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ ساتھ علاقہ، تہذیب اور وقت مقرر (Time Bound) ہونا چاہیے۔ قومی اتحاد نے تجویز پیش کی ہے کہ ضلع کی سطح پر اطلاعاتی مواد کی فراہمی کے لیے ایک وسیع ادارہ (Consortium) قائم کیا جانا چاہیے تاکہ دیہی اطلاعاتی مراکز کے منیجروں کی رسائی موسم، صحت، ای. گورننس، قرض اور انشورنس زراعت اور بازار جیسے شعبوں سے متعلق معلومات تک ہو سکے۔ اس کے لیے دیہی اطلاعاتی مراکز کے منیجروں کو اطلاعاتی مواد کنسورشیم سے ہمیشہ فعال رابطہ رکھنا ہوگا۔ مناسب جگہ اور وقت پر مناسب اطلاعات فراہم کرنے کے لیے یہ تجویز رکھی گئی ہے کہ زراعت، تعلیم، صحت اور روزگار سے متعلق قومی ڈیجیٹل گزرگاہ بنائی جائیں۔

صلاحیت کی نشوونما کے شعبے میں یہ تجویز رکھی گئی ہے کہ جمشید جی ٹاٹا قومی ورچول اکیڈمی برائے دیہی خوشحالی (NVA) کے زیر اہتمام ہر گاؤں سے کم از کم ایک مرد اور ایک عورت کو کمپیوٹر خواندہ بنایا جائے۔ ویسے لوگ جو تربیت کار استاد کے لائق صلاحیت کا مظاہرہ کریں گے، انھیں اکیڈمی (NVA) اپنا فیلو (Fellow) منتخب کر لے گی۔ ایم. ایس. سوامی ناتھن ریسرچ فاؤنڈیشن کے دیہی اطلاعاتی مراکز پروگرام سے گذشتہ آٹھ برسوں کے تجربے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ خاص طور سے دیہی خواتین 15 دنوں کے اندر اطلاعاتی و مواصلاتی ٹیکنالوجی پر دسترس حاصل کر لیتی ہیں بشرطیکہ تدریسی طریقۂ کار ''کیجیے اور سیکھیے'' پر مبنی ہو۔ NVA کے دیہی فیلو اطلاعاتی انقلاب کے علم بردار ہوں گے۔

اطلاعاتی سماج پر ہونے والی ٹیونس عالمی اجلاس میں یہ بات سامنے آئی کہ 2003 کے جنیوا اجلاس سے لے کر آج تک ٹیکنالوجی کے فروغ اور ترقی میں شاندار پیش رفت ہوئی ہے۔ پھر بھی فی الوقت دنیا میں دو متضاد قسم کے حالات نظر آ رہے ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی میں دھماکہ خیز ترقی کی وجہ سے عوام الناس کو صحت، خوراک، پانی، کام، توانائی اور خواندگی جیسے شعبوں میں نئی نئی سہولیات حاصل ہو رہی ہیں۔ لیکن دوسری جانب بنی نوع انسان کا ایک قابل لحاظ حصہ غربت، بھوک اور محرومی کی زندگی بسر کر رہا ہے اور ان کے اندر سماجی علاحدگی اور ناانصافی کا احساس پایا جاتا ہے۔

ان حالات کے نتیجے میں انسانی معاشرے میں تشدد کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ایک جانب تکنیکی ایجادات پر مبنی ایک نئی پرعزم دنیا کے توقعات کے درمیان اطلاعاتی سماج پر عالمی میٹنگ (WSIS) جاری تھی لیکن دوسری جانب دنیا کے مختلف علاقوں میں بم دھماکوں سے بے گناہ انسانی جانوں کا زیاں ذرائع ابلاغ کی اہم خبریں تھیں۔ ساری دنیا میں بہ یک وقت پرتعیش معیار زندگی اور انتہائی غربت کا معاملہ ساتھ ساتھ چل رہا ہے جو کہ محض فطرت سے ہی نہیں بلکہ ایک دوسرے سے بھی ہم آہنگ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''مشن 2007: ہر گاؤں، ایک معلوماتی مرکز'' اپنی کامیابی، انسانی سلامتی اور ملک کی ترقی کے لیے انتہائی ضروری ہے۔

(بشکریہ ''دی ہندو'' نئی دہلی، 25 نومبر 2005)

□□□

مترجم کا پتہ:
525/6A, 3rd Floor
Zakir Nagar, Okhla
New Delhi-110025

جدیدیت کی فلسفیانہ اساس

مصنف: شمیم حنفی

پروفیسر شمیم حنفی کی اس کتاب میں جو جدیدیت اور نئے فکری اور فلسفیانہ میلانات کے سیاق میں حوالے کی حیثیت رکھتی ہے وجودیت اور مارکسیت سمیت ادب، زبان اور آرٹ سے تعلق رکھنے والے تمام اہم مکاتب فکر اور تصورات سے بحث کی گئی ہے۔ ادب میں قدیم و جدید کی کشمکش اور نئے طرز احساس و اظہار کے حوالے سے ایک اہم کتاب۔

صفحات: 292، قیمت: -/114 روپے

نئی شعری روایت

مصنف: شمیم حنفی

اردو میں جب جدیدیت کے رجحان نے زور پکڑا اور اس وقت کے نئے لکھنے والوں میں اسے غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی تو اس کی موافقت اور مخالفت میں بہت کچھ لکھا گیا۔ پروفیسر شمیم حنفی نے موافق اور مخالف دونوں طرح کی آرا کو سامنے رکھ کر تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔

صفحات، 239، قیمت: -/96 روپے

نوٹ: طلبه کے لیے 45% اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-066 110

محمد عمر رضا

تمباکونوشی

کوکین، ہیروئن، حشیش (بھانگ)، کیفین، تھیوبرومین اور الکحل وغیرہ کے ساتھ ساتھ تمباکو کا استعمال بھی منشیات کے طور پر تقریباً سبھی خطوں اور تہذیبوں میں برسوں سے ہوتا چلا آیا ہے۔ تمباکو ایک خاص قسم کا پودا ہوتا ہے جس کا نباتاتی نام ''نکوٹانا نوبیکم'' (Nicotiana Tobacum) ہے۔ اس کی کاشت صرف اس کے پتوں کے لیے کی جاتی ہے جس کا استعمال اس سے تیار کی جانے والی متعدد مصنوعات میں بڑے پیمانے پر ہوتا ہے۔ امریکہ میں سب سے پہلے تمباکو کی کاشت ہوئی۔ آج پوری دنیا میں اسے بڑے پیمانے پر اگایا جاتا ہے اور اس کی تجارت سے حکومتوں کو کروڑوں کا فائدہ ہوتا ہے۔ امریکہ کے علاوہ چین، ہندوستان، برازیل، روس اور ترکی وغیرہ تمباکو پیدا کرنے والے اہم ممالک ہیں۔ امریکہ تو اپنی سالانہ پیداوار کا ایک تہائی سے زیادہ دوسرے ممالک کو برآمد کر دیتا ہے۔

ہندوستان میں تمباکونوشی کی وبا یورپ سے آئی۔ 1615 میں شہنشاہ جہاں گیر کے زمانے میں برطانیہ کے جیمس اول نے سر تھامس رو کو اپنا سفیر بنا کر ہندوستان بھیجا تھا۔ تین سال تک وہ شہنشاہ کی خدمت میں رہا۔ اکثر جہاں گیر اسے دربار میں بلاتے تھے۔ ایک بار سر تھامس رو نے جہاں گیر کو ایک تصویر اور تمباکو کا پتا پیش کیا۔ شہنشاہ نے جسے مصوری سے لگاؤ تھا، تصویر کو بہت پسند کیا اور تمباکو کے خواص سن کر محظوظ ہوا۔ فرشی حقے میں خمیرۂ تمباکو اسی زمانے سے بھرا جانے لگا۔ رفتہ رفتہ اس نے اس قدر سنگین صورت اختیار کر لی کہ آج اس سے لاکھوں لوگوں کی جانیں تلف ہو رہی ہیں۔

ہمارے ملک میں تمباکو سے بنی مصنوعات مثلاً سگار، سگریٹ، بیڑی، حقے کا تمباکو (خمیرہ)، کھانے کا تمباکو (زردہ) اور گٹکھا وغیرہ بڑے شہروں سے لے کر ایک چھوٹے سے گاؤں تک کم و بیش ہر جگہ بآسانی دستیاب ہیں۔ ملک میں تمباکو کا ایک بہت بڑا کاروبار ہے جس سے حکومت کو ٹیکس کی شکل میں خطیر رقم بھی حاصل ہوتی ہے۔ تمباکونوشی میں سب سے زیادہ ہمارے نوجوان ملوث ہیں جو کسی بھی ملک اور معاشرے کے لیے انتہائی تباہ کن ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ہمارے ملک میں صرف تمباکونوشی کے سبب ہر سال تقریباً دس لاکھ افراد موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مزید ایک بڑی تعداد ایسے افراد کی بھی ہے جو وقتاً فوقتاً محض تفریح اور شوق کے لیے تمباکونوشی کرتے ہیں۔ جب کہ ان کا یہ شوق رفتہ رفتہ ایک اضافی ضرورت میں تبدیل ہو جاتا ہے جو بعد میں وبالِ جان ثابت ہوتا ہے۔ تمباکو اور دیگر نشہ آور اشیا کے درمیان بہت فاصلہ ہوتا ہے۔ دیگر نشہ آور اشیا کی طرح تمباکو کا بھی شوقیہ استعمال کرنے والوں کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ کب ان کا شوق ان کی اہم ضرورت بن گیا۔ خبر تو انھیں اس وقت ہوتی ہے جب وہ مکمل طور سے تمباکو کے اسیر اور غلام بن جاتے ہیں اور اس کی عدم فراہمی اور غیر موجودگی کی صورت میں جب وہ اضطراب و بے چینی سے دوچار ہونے لگتے ہیں۔

آج تمباکونوشی میں مغربی ممالک سے لے کر ایشیا کے غریب ممالک تک جس تیزی سے اضافہ ہوتا جا رہا ہے، وہ یقیناً باعث تشویش ہے۔ تمباکو نوشی کی لعنت اور جان لیوا تجارت میں ترقی پذیر اور ترقی یافتہ سبھی ممالک ملوث ہیں۔ جب کہ تحقیق سے یہ بات ثابت کی جا چکی ہے کہ تمباکو کا کسی بھی شکل میں استعمال انسانی زندگی کے لیے انتہائی خطرناک اور مضر ہے۔ اس کے مضر اور جان لیوا عناصر کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ تمباکو میں شامل نکوٹین (Nicotine) کے صرف دو یا تین قطرات لینے سے انسان منٹوں میں لقمۂ اجل بن سکتا ہے۔

نکوٹین تمباکو کی پتیوں میں 0.54 سے 8 فیصد تک پایا جاتا ہے۔ مائع شکل میں صاف، شفاف اور پانی میں تحلیل پذیر مگر ہوا کے ربط سے یہ پیلا ہو جاتا ہے۔ مشاہدہ ہے کہ کثرتِ استعمال کے سبب سگریٹ پینے والوں کی انگلیوں کی جلد تک زرد ہو جاتی ہے۔ ہندوستان میں محض سگریٹ کا استعمال کرنے والوں میں سے تقریباً چار لاکھ افراد ہر سال موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔ یہی نہیں تمباکو میں شامل نائٹروس امینیس، کاربن مونو آکسائیڈ دل، پھیپھڑے اور معدے وغیرہ کی متعدد خطرناک اور جان لیوا بیماریوں کا سبب بنتے ہیں۔ خاص طور پر انسان کینسر جیسے مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ تمباکو کا استعمال پان یا گٹکھا کی شکل میں کرنے سے منہ کا کینسر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح سگریٹ، سگار، بیڑی اور حقہ وغیرہ کے ذریعے دھوئیں کی شکل میں تمباکو کے زہریلے اجزا کو اپنے اندر جذب کرنے سے پھیپھڑے اور دل کا کینسر ہونے کا خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ حالیہ تحقیق کے مطابق دنیا میں 70 فیصد کینسر کا مرض محض سگریٹ نوشی کے سبب ہوتا ہے۔

عالمی تنظیم صحت (W.H.O.) کی حالیہ رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت دنیا میں موت کی دوسری سب سے بڑی وجہ تمباکونوشی ہے۔ پوری دنیا

میں ہر دس میں سے ایک بالغ شخص تمباکو نوشی کے سبب موت کا شکار ہو جاتا ہے۔ پچاس لاکھ افراد ہر سال محض تمباکو نوشی کی وجہ سے لقمۂ اجل بن جاتے ہیں۔ رپورٹ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ آج دنیا کی آدھی آبادی تمباکو نوشی میں ملوث ہے۔

عالمی پیمانے پر جس طرح تمباکو نوشی کی وبا عام ہے اور اس سے جس قدر اموات واقع ہو رہی ہیں، اس سے پوری دنیا پریشان ہے اور اس پر قابو پانے کے لیے مختلف اقدامات بھی اٹھائے جا رہے ہیں۔ مثلاً ہمارے ملک میں 18 سال سے کم عمر کے نوجوانوں کو تمباکو سے بنی مصنوعات بیچنے پر مکمل پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ اسی طرح تمباکو سے بنی مصنوعات کے اشتہارات پر بھی مکمل پابندی ہے۔ مزید اس کے نقصانات اور مضر اثرات کے متعلق عوام میں بیداری پیدا کرنے کی غرض سے ریڈیو، ٹیلی ویژن، رسائل، اخبارات، انٹرنیٹ اور دیگر ذرائع کا استعمال بھی کیا جا رہا ہے لیکن ابھی مزید اقدامات اٹھانے کی ضرورت ہے۔ خاص طور سے حکومت کو کوئی ایسا لائحۂ عمل تیار کرنا چاہیے جس سے یہ اقدامات صرف کاغذی کارروائی تک ہی محدود ہو کر نہ رہ جائیں بلکہ ان پر مسلسل اور حقیقی عمل بھی ہو۔ عوام میں سائنسی دلائل کے ساتھ اس کے زہریلے اثرات کی تشریح و توضیح کے لیے شہروں کے علاوہ چھوٹے سے چھوٹے گاؤں میں بیداری لانے کی اشد ضرورت ہے۔ خاص طور سے نئی نسل کو اس کے متعلق سنجیدگی سے باور کرانے کی ضرورت ہے کہ وہ اس کا استعمال نہ کریں کیوں کہ تمباکو نوشی سے انسان شعوری یا غیر شعوری طور پر وقتی لذت کے لیے اپنے جسم کو مختلف بیماریوں کی آماجگاہ بنانے کے ساتھ ساتھ خود کو موت کے منہ میں تو دھکیلتا ہی ہے، دوسروں کو بھی موت کی طرف لے جانے کے لیے ذمہ دار ہوتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ جو لوگ تمباکو نوش کے ارد گرد رہتے ہیں، ساتھ اٹھتے اور بیٹھتے ہیں، ان پر بھی اس کا منفی اثر پڑتا ہے۔ جن زہریلے اور جان لیوا اجزا کو تمباکو نوش دھوئیں کے ذریعے براہ راست اپنے اندر جذب کرتا ہے، آس پاس کے رہنے والے اپنی سانس کے ذریعے ان زہریلے اجزا کو بالواسطہ لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس لیے تمباکو نوشی محض تمباکو نوش کو ہی موت کی طرف نہیں لے جاتی بلکہ اس کے آس پاس کے دیگر افراد پر بھی اس کے مضر اثرات ہوتے ہیں۔ چنانچہ تمباکو نوشی سے قبل ہمیں بڑی سنجیدگی سے اس کے مضر اثرات پر غور کرنا چاہیے تاکہ ہم یہ فیصلہ کرنے میں کسی قسم کی دشواری یا مخمصے کا شکار نہ ہوں کہ ہمارے لیے موت کی طرف قدم بڑھانا بہتر ہے یا اپنی قیمتی زندگی کو ایک صحت مند معاشرے کی تعمیر و تشکیل کے لیے وقف کرنا۔ بدقسمتی سے اگر تمباکو نوشی کی بری لت لگ بھی گئی تو اسے جلد از جلد ترک کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس سے نجات پانے کا آسان طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ جب بھی تمباکو کی شدید خواہش ہو، ہم کسی صحت مند اور تعمیری کام میں خود کو مصروف کر لیں۔

غرض تمباکو اور تمباکو سے بنی مصنوعات کا کسی بھی شکل میں استعمال ہماری صحت کے لیے انتہائی تباہ کن ہے۔ اس پر قابو پانے کے لیے اگر چہ قومی اور بین الاقوامی سطح پر کوششیں جاری ہیں اور جب تک یہ وبا دنیا میں عام ہے، اس طرح کی کوششیں جاری رہیں گی لیکن پھر بھی ضرورت اس بات کی ہے کہ عوام اور خواص دونوں خود اس کے خطرناک نتائج پر غور کریں اور اس سے جتنی جلد ممکن ہو نجات حاصل کریں۔ بالخصوص نئی نسل کو اس کے خلاف باقاعدہ ایک تحریک چلانی چاہیے اور اپنے ساتھ ساتھ دیگر لوگوں کو بھی ان زہریلے اور موت کا موجب بننے والی اشیا سے دور رکھنے کی پیہم کوشش کرنی چاہیے۔

□□□

224-E, Mahanadi
JNU, New Delhi-110067

لفظ

شاعر: آل احمد سرور

پروفیسر آل احمد سرور کا شمار اردو کے دیدہ ور نقادوں میں ہوتا ہے مگر وہ ایک نغز گو شاعر بھی تھے۔ ان کی شاعری ماضی کے اکتسابات کی حامل، حال کے میلانات کی ترجمان اور مستقبل کے امکانات کی نقیب ہے۔ سرور صاحب کی زندگی میں ان کے تین شعری مجموعے "سلسبیل"، "ذوقِ جنوں" اور "خواب اور خلش" شائع ہوئے۔ "لفظ" ان کا آخری شعری مجموعہ ہے۔

صفحات: 95، قیمت: -/64 روپے

مقالاتِ مسعود

مصنف: مسعود حسین خاں

یہ کتاب ممتاز ماہر لسانیات پروفیسر مسعود حسین خاں کے سولہ علمی مضامین کا مجموعہ ہے جن میں اردو صوتیات، اقبال کا صوتی آہنگ، غالب کے خطوط کی لسانی اہمیت، اردو لغت نویسی کے مسائل وغیرہ مختلف موضوعات زیر بحث آئے ہیں۔

صفحات: 230، قیمت: -/18.50 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45% اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر.کے. پورم، نئی دہلی-110 066

آخری قسط

تحریر: مدن گوپال
ترجمہ: فاخر شہیر عباسی

دو قومی نظریے کا خاتمہ

1857 کی پہلی جنگ آزادی کے بیس برسوں بعد وکٹوریہ نے ہندوستان کی ملکہ کا خطاب اختیار کیا۔ 1877 کے اس عظیم واقعے کے وقت سیلے (Seelay) نے، برطانوی سلطنت کی توسیع کے لیے قدم اٹھاتے ہوئے واضح طور پر اس پالیسی کی وضاحت کی جس کی آنے والے دنوں میں پیروی کی جانی تھی۔ اور یہ پالیسی تھی ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو''۔ ابھی تک مسلمانوں کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اب ان کی طرف داری کی جارہی تھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اسی وقت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا قیام عمل میں آتا ہے اور اردو زبان کا فروغ مسلم فرقے کی زبان کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کے اکیس برسوں کے اندر انگریزوں نے ایسے قدم اٹھائے جس سے انڈین مسلم لیگ کا قیام عمل میں آسکے۔ اس کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے علاحدہ انتخابات شروع کیے گئے۔ ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' پالیسی کی ایک مثال ریاست بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کرنا تھا، جس میں ایک حصہ ہندو اکثریت اور دوسرا مسلم اکثریت والا تھا۔ نہ صرف بنگال میں بلکہ پورے ہندوستان میں فرقہ وارانہ بنیاد پر بنگال کی تقسیم کی مخالفت سودیشی تحریک کا ایک حصہ بن گئی۔ دہشت پسند تنظیموں کی طرف سے بھی اس کی مخالفت کی گئی۔ اضطراب اتنا شدید تھا کہ انگریزوں کو دارالحکومت کلکتہ سے دہلی منتقل کرنا پڑا اور تقسیم بنگال کو منسوخ کرنا پڑا۔ قوم پرستی کو کامیابی حاصل ہوئی لیکن صرف چھتیس برسوں کے لیے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں سیاسی منظر نامے پر ایک طرف انتہا پسند سمجھے جانے والے لال، بال، پال گروہ اور دوسری طرف گوپال کرشن گوکھلے، دادا بھائی نوروجی وغیرہ کا غلبہ تھا۔ کانگریس کا کلکتہ اجلاس دادا بھائی نوروجی کی صدارت میں ہوا جس میں محمد علی جناح ان کے سکریٹری تھے۔ جناح کی شناخت ایک فرقہ پرست کے طور پر ہے اس کے باوجود وہ ایک سیکولر ذہن انسان اور تحریک آزادی کے ایک فعال ممبر تھے۔ لیکن وہ آئین کے حامی تھے۔ 1916 میں لکھنؤ میں کانگریس اور مسلم لیگ کے بیک وقت ہونے والے اجلاس کے لیے وہ ذمے دار تھے۔ وہ ہوم رول تحریک کا بھی ایک حصہ تھے۔ جب گاندھی جی آئے تو انھوں نے ایک نئی چیز پیش کی، وہ تھی ستیہ گرہ تحریک۔ آنے والے برسوں میں ہندوستان کے سیاسی منظر نامے پر گاندھی کا غلبہ ہوگیا اور دوسرے بہت سے لوگ پس منظر میں چلے گئے۔ جناح بنیاد پرستی کے خلاف تھے۔ لیکن گاندھی جی نے خلافت کو قومی تحریک میں شامل کرلیا۔

1922 میں عدم تعاون کی تحریک کے واپس لیے جانے کے بعد سیاسی منظر نامے میں ایک خلا پیدا ہوگیا تھا۔ انگریزوں نے فرقہ وارانہ فسادات کو بڑھاوا دیا جو نمک ستیہ گرہ تحریک تک جاری رہا۔ 1929 میں کانگریس کے کلکتہ اجلاس میں نہرو رپورٹ پر بحث کی گئی۔ پھر جناح کے لیے ایک اہم موڑ آیا۔ اب انھوں نے مسلمانوں کے مسائل کا بیڑا اٹھالیا۔ حالانکہ لندن کی گول میز کانفرنس میں کیمبرج کے ایک طالب علم چودھری رحمت علی کے ذریعے پیش کی گئی پاکستان کی تجویز انھیں پسند نہیں آئی۔ 1935 میں وہ لندن چلے گئے جہاں رہ کر وہ وکالت کرنا چاہتے تھے۔ یہی وہ وقت تھا جب انگریز سیاست دانوں نے گاندھی جی کے مقابلے میں ایک مسلم رہنما کو منظر عام پر لاکر ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی اپنی پالیسی کو آگے بڑھایا۔ انھیں اس بات کے لیے تیار کیا گیا کہ وہ ہندوستان واپس جاکر مسلمانوں کے رہنما کی حیثیت سے میدان سیاست میں داخل ہوں۔ اس کا مقصد اس بات کی تشہیر کے ذریعے، کہ ہندوستان میں ہندوؤں کی اکثریت ہونے کی بنا پر مسلمان یہاں ہمیشہ اقلیت میں رہیں گے، قومی آزادی کی تحریک میں رخنہ ڈالنا تھا۔ اس کا ایک ہی راستہ تھا کہ ان کے لیے ایک الگ ملک ہو۔ یعنی کہ دو قومی نظریہ۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران برطانوی حکومت جنگ کی جدوجہد میں زیادہ سے زیادہ تعاون چاہتی تھی۔ انڈین نیشنل کانگریس نے بھارت چھوڑو تحریک شروع کی اور اس کے رہنماؤں کو قید کرلیا گیا۔ محمد علی جناح نے اس صورت حال کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ میڈیا صرف جناح کو بڑھاوا دے رہا تھا۔ انگریزوں کی مدد سے میڈیا نے انھیں مسلمانوں کے اتنی ہی بڑی قد وقامت کا

"Turning Points of Indian History" جناب مدن گوپال کی بے حد اہم کتاب ہے جس میں ہندوستانی تاریخ کے ان پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے جنھوں نے ہندوستانی تاریخ کے دھارے کا رخ موڑ دیا۔ ''اردو دنیا'' میں اس کا ترجمہ ''ہندوستانی تاریخ کے اہم موڑ'' کے نام سے قسط وار شائع کیا جارہا تھا جس کی آخری قسط پیش ہے۔

رہنما بنا کر پیش کیا جیسا کہ انگریزوں کے مطابق ہندوؤں کے درمیان گاندھی تھے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا جناح ایک قوم پرست اور سیکولر انسان تھے۔ وہسکی پیتے تھے اور مکمل طور سے ایک مغربی طرز زندگی گزارتے تھے۔ یہ سیاست تھی جس نے انھیں مذہبی کارڈ کھیلنے پر مجبور کیا۔ حالیہ برسوں میں کی گئی چند تحقیقوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ بنیادی طور پر ہندوستان اور پاکستان کی ریاستوں میں برصغیر کی تقسیم کے لیے برطانیہ ذمے دار تھا۔

جناح نے کبھی بھی پاکستان کے تصور یا اس کی متعین صورت کی وضاحت نہیں کی۔ 14 اگست 1947 کو پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کو دیئے گئے اپنے افتتاحی خطاب میں انھوں نے اپنی شریف النفسی کا ثبوت دیتے ہوئے کہا تھا کہ ''آپ آزاد ہیں، آپ اپنے مندروں میں جانے کے لیے آزاد ہیں۔ آپ اپنی مسجدوں میں جانے کے لیے آزاد ہیں یا پاکستان میں کسی بھی دوسرے عبادت خانے میں جانے کے لیے آزاد ہیں۔ آپ کسی بھی مذہب، ذات یا نسل سے تعلق رکھتے ہوں اس کا اس بنیادی اصول سے کچھ لینا دینا نہیں ہے کہ ہم پاکستان کے باشندے ہیں اور ہم سب یکساں ہیں۔ اب میرے خیال میں ہمیں اس بات کو ایک آئیڈیل کی طرح اپنے سامنے رکھنا چاہیے۔ (جناح کی تقریر کو کاٹ چھانٹ کر اور اس اقتباس کو حذف کرنے کے بعد پریس میں بھیجا گیا۔)

حالانکہ نئی پاکستانی حکومت کا مغربی حصہ پنجاب، سندھ، شمال مغربی صوبے اور بلوچستان پر مشتمل تھا اور مشرقی حصہ بنگال کے مشرقی حصے اور آسام کے کچھ علاقوں پر مشتمل تھا، اس کا دارالحکومت کراچی بنا نہ کہ زیادہ آبادی والا مشرقی پاکستان۔ مشرقی پاکستان پر مغربی پاکستان کا غلبہ رہا۔ اسی نے پورے ملک کے لیے پالیسیاں وضع کیں۔ اس کے افسران اور فوج کی بڑی تعداد پنجابیوں پر مشتمل تھی۔ تاریخی وجوہات کی بنا پر اس نے اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت سے اختیار کیا جو مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں میں سے کسی کی بھی زبان نہیں تھی اور یہ مشرقی پاکستان کی بھی سرکاری زبان ٹھہرائی گئی جو تہذیبی اور لسانی اعتبار سے مغربی بنگال سے زیادہ قریب تھا۔ 1962 میں کراچی میں یوم اقبال کے موقعے پر بابائے اردو مولوی عبدالحق نے کہا کہ پاکستان جناح یا مسلم لیگ کے ذریعہ نہیں بنایا گیا بلکہ یہ اردو اور اس کے گرد پھیلے تنازعے کی وجہ سے وجود میں آیا۔ اس طرح یہ زبان مشرقی پاکستان پر جبراً تھوپ دی گئی۔ مشرقی پاکستان کے لوگوں نے اس کے خلاف زبردست احتجاج کیا جو اپنی بے حد ترقی یافتہ بنگالی زبان سے پیار کرتے تھے۔ احتجاجی مظاہروں نے تشدد کی شکل اختیار کر لی جس میں لاتعداد بنگالیوں کی جان گئی۔ ان کی شہادت کو ڈھاکہ میں ہر سال یاد کیا جاتا ہے۔ عوامی لیگ کی سرپرستی میں ایک تحریک شروع ہوئی جس نے مشرقی پاکستان کی خودمختاری کی مانگ کی۔ اس تحریک کو پنجابی غلبے والی فوج اور بیوروکریسی کے ذریعے کچل دیا گیا۔

دراصل پاکستان کے مشرقی اور مغربی حصے کے درمیان مذہب کے علاوہ کوئی مماثلت نہیں تھی۔ پاکستان اسی بنیاد پر وجود میں آیا تھا۔ 1947 میں دونوں ممالک نے ایک جیسی صورت حال کے ساتھ نئے سفر کا آغاز کیا تھا۔ ہندوستان میں جمہوریت کامیاب رہی لیکن پاکستان کے جمہوری ادارے کمزور ہو گئے۔ دراصل ایک خودمختار ملک کی حیثیت سے اس کے وجود میں آنے کے بعد سے زیادہ تر یہاں پر فوجی حکومت رہی۔ 1956 میں جنرل سکندر مرزا نے اقتدار پر قبضہ کر لیا، 1959 میں جنرل ایوب خاں نے ان کی جگہ لی۔ انھوں نے 1968 تک حکومت کی۔ ان کے بعد یحییٰ خاں نے اقتدار پر قبضہ جمایا۔ اکثر ممالک ملک کی حفاظت کے لیے فوج ترتیب دیتے ہیں، پاکستانی فوج نے اپنے وجود کے بعد سے ہی اپنے ذاتی مفادات کے لیے ملک کا استعمال کیا۔ ایک طویل عرصے تک یہاں مارشل لا قائم رہا۔ دراصل وہاں کمانڈر۔ ان چیف ہی ملک کا سربراہ ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ فوجی افسران مختلف شہری معاملات میں بھی دخیل تھے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ مشرقی پاکستان کے مقابلے مغربی پاکستان کی آبادی کم تھی اور مشرقی پاکستان دنیا کی جوٹ کی کل پیداوار کا اکیلے پچاس فیصد پیدا کرتا تھا اور تیل اور گیس کی فراوانی تھی اور یہ پاکستان کی اقتصادی خوش حالی میں واقعتاً معاون تھا، مغربی پاکستان اس سے ایک نوآبادی جیسا برتاؤ کرتا تھا۔

جب 1970 کے عام انتخابات میں شیخ مجیب الرحمن کی عوامی لیگ قومی اسمبلی میں سب سے بڑی جماعت کی حیثیت سے ابھر کر آئی تو ذوالفقار علی بھٹو سمیت مغربی پاکستانی رہنما حیرت زدہ رہ گئے۔ بھٹو شیخ سے بات کرنے کے لیے ڈھاکہ گئے۔

عوامی لیگ کے ذریعے کی جانے والی حکومت سازی کی کوششوں کو روک دیا گیا۔ مشرقی پاکستان میں اس پر کافی احتجاج ہوا جسے کچل دیا گیا۔ پنجابی فوج اور افسران کے دل میں بنگالیوں کے لیے کوئی عزت نہیں تھی۔ ٹکا خاں کی ماتحتی میں فوج نے ایسی بربریت کا مظاہرہ کیا جو اس سے قبل کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ صورت حال اتنی خراب ہو گئی کہ مشرقی پاکستان سے بڑی تعداد میں (تقریباً ایک کروڑ) لوگوں نے ہجرت کر کے ہندوستان میں پناہ لی۔ بڑی تعداد میں لوٹ مار، آتش زنی اور بنگالی عورتوں کی اجتماعی آبروریزی کی گئی۔ بعد میں یہ سب باتیں حمید الرحمن رپورٹ میں منظر عام پر آئیں۔

ہندوستان نے اس مسئلے کو عالمی سطح پر اٹھایا۔ اندرا گاندھی نے بذات خود مغربی ممالک کا سفر کر کے لوگوں کو مشرقی پاکستان کی صورت حال سے آگاہ کیا۔ اس کا کوئی ردعمل دیکھنے میں نہیں آیا۔ دراصل نکسن کی سربراہی میں امریکی حکومت کھلے عام یحییٰ خاں کے فوجی اقتدار کے حق میں تھی۔ پناہ گزین مسلمانوں نے، جو ہندوستان چلے آئے تھے، ایک 'مکتی واہنی' تشکیل دی اور جلا وطنی میں ایک طرح کی حکومت قائم کی۔ مشرقی بنگال میں خانہ جنگی جیسی صورت حال تھی یا دوسرے لفظوں میں ایک ملک کی حکومت کی اپنے ہی عوام کے خلاف جنگ۔ اور جب صورتحال ابتر ہوگئی تو یکم دسمبر 1971 کو پاکستانی حکومت نے ہندوستان کے خلاف جنگ کا اعلان کردیا۔ ہندوستانی فوج نے مکتی واہنی کی مدد سے مغربی پاکستان کے ایک لاکھ کے قریب فوجیوں کے ہاتھوں اپنی زمین کو آزاد کرانے کی کوشش میں ان کا ساتھ دیا۔ صدر نکسن نے بھی اپنے توپ بحری بیڑے کو خلیج بنگال میں جانے کا حکم دیا۔ ہندوستانی فوج کو مغربی محاذ پر بھی چنوتی کا سامنا کرنے کے لیے جانا پڑا۔ اس نے سندھ کے علاقے میں تین ہزار مربع میل سے زیادہ حصے پر قبضہ کرلیا۔ 93,000 لوگ جنگی قیدی بنا لیے گئے۔ ہندوستانی بحریہ بھی کراچی بندرگاہ کی ناکہ بندی کرنے کے لیے آگے بڑھا۔ ہندوستانی فوجوں کی نقل و حرکت اتنی تیز رفتار تھی کہ سولھویں دن پاکستان کے جنرل نیازی نے ڈھاکہ میں ہتھیار ڈال دیے۔ ہندوستان نے یک طرفہ جنگ بندی کا اعلان کردیا۔ 16 دسمبر 1971 کو بنگلہ دیش ایک خود مختار حکومت کی حیثیت سے منظر عام پر آیا۔ دو قومی نظریے کے خواب کو بنگالی اور ہندوستانی مسلح فوجوں نے مسمار کردیا۔

بعد کے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرقہ واریت کا جو زہر مشرقی پاکستان کے جسم میں ڈالا گیا تھا وہ نئی بنگلہ دیشی جمہوریت میں بھی طاعون کی طرح پھیلا۔ 15 اگست 1975 کو فوجی عملے میں موجود بنیاد پرستوں نے شیخ مجیب الرحمن، ان کی اہلیہ اور ان کے سبھی عزیز و اقارب کو قتل کردیا۔ ضیاء الحق کے دور حکومت میں ہر فوجی افسر کو یہ عہد کرنا ہوتا تھا کہ وہ ہندوستان سے 1971 کا بدلہ ضرور لیں گے۔ ریڈ کلف لائن کے آر پار دو ملکوں میں ہندوستان کی تقسیم سے دراصل مسائل کا کوئی حل نہیں نکلا۔

خود پاکستان میں بھی فرقہ واریت کے مسئلے نے پریشان کن حد تک جڑ پکڑ لیا۔ سنی اور شیعہ ایک دوسرے کے بالکل مخالف بن گئے۔ احمدیوں کو مسلمان ہی نہیں سمجھا جاتا۔

بنگلہ دیش میں بہاری مسلم کہلائے جانے والے چار لاکھ لوگ آج بھی اپنی قسمت کو کوس رہے ہیں۔ ان کے لیے تقسیم سے ان کے مسائل کا کوئی حل نہیں نکلا تھا اور نہ ہی تقریباً ان دس لاکھ مسلم مہاجرین کے لیے جنھوں نے پاکستان ہجرت کی تھی اور آج صرف کراچی تک محدود ہوکر رہ گئے ہیں۔ مہاجر قومی موومنٹ کے رہنما الطاف حسین کا کہنا ہے کہ تقسیم ایک بڑی غلطی تھی جس نے برصغیر کے مسائل کو حل نہیں کیا۔ مہاجرین دو قومی نظریے پر اعتماد کرکے آج اپنی تقدیر کو رو رہے ہیں۔

□□□

مترجم کا پتہ:
355, Jhelum Hostel
JNU, New Delhi-110067

مجموعۂ نغز

مصنف: قدرت اللہ قاسم

حکیم ابوالقاسم میر قدرت اللہ المتخلص بہ قاسم کا لکھا ہوا شعرائے اردو کا یہ مشہور تذکرہ، دو جلدوں میں تھا جسے فاضل مرتب پروفیسر محمود شیرانی نے یکجا کردیا ہے۔ پروفیسر شیرانی کا خیال ہے کہ محمد حسین آزاد کی مشہور تالیف آب حیات کا ایک اہم ماخذ یہ تذکرہ بھی ہے جس کا قلمی نسخہ انھیں آزاد کے ذخیرۂ کتب سے دستیاب ہوا۔

دوسرا ایڈیشن: صفحات: 492، قیمت -/268 روپے

عربی ادب کی تاریخ (تین جلدوں میں)

مصنف: ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی

مدارس کے علاوہ ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں عربی زبان و ادب کی تعلیم دی جاتی ہے۔ لیکن اب تک اردو میں کوئی ایسی کتاب دستیاب نہیں تھی جس میں عربی ادب کی جامع اور مبسوط تاریخ بیان کی گئی ہو۔ ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی کی یہ کتاب اس کمی کو پورا کرتی ہے۔ کتاب کی پہلی جلد میں زمانۂ جاہلیت، دوسری جلد میں حضرت محمدؐ کے عہد سے خلفائے راشدین کے عہد نیز اموی دور اور تیسری جلد میں عباسی دور کا احاطہ کیا گیا ہے۔

صفحات: جلد اول: 352، جلد دوم: 390، جلد سوم: زیر طبع
قیمت: جلد اول: 86 روپے، جلد دوم: 91 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45% اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-066 110

سید مزمل الدین

اشتہارات کے ذریعے معلومات و پیامات کا فروغ

آج کل اشتہارات ذرائع ابلاغ کا اہم حصہ بن چکے ہیں۔ اسی لیے آپ کو اشتہارات صرف اخبارات یا ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر ہی نہیں بلکہ جگہ جگہ نصب شدہ ہورڈنگ، الیکٹرانک مانیٹروں، بسوں، ٹرینوں، کلینڈروں، ڈائریوں اور انٹرنیٹ اور ایس.ایم.ایس. پر بھی نظر آجاتے ہیں۔ اشتہارات ہماری روزمرہ کی زندگی کا لازمی حصہ بن چکے ہیں، اشتہارات میں مروجہ معلومات و پیامات کے چار بنیادی اجزا ہیں:

1. پیام کا مواد
2. پیام کا خاکہ
3. پیام کی پیش کش
4. پیام کا پیش کنندہ

پیام کا مواد:

اشتہارات کے پیام کا مواد مندرجۂ ذیل اپیلوں پر مشتمل ہوتا ہے:

عقلی دلائل: یہ دراصل ان اپیلوں پر مشتمل ہوتے ہیں جو صارفین کی غور و فکر کو کسی جانب مرکوز کرتے ہوں، جیسے:

- مناسب قیمت۔
- اصل اشیا کے ساتھ مفت اشیا۔
- بازار میں دستیاب شے کی زیادہ دنوں تک پائیداری وغیرہ۔

جذباتی اپیلیں: یہ اپیلیں صارفین کے جذبات اور ان کے احساسات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کی جاتی ہیں۔ یہ اپیلیں دو طرح کی ہوتی ہیں۔ مثبت اور منفی۔

(i) **مثبت اپیلیں:** فطری طور پر صارفین کو خوش کر دینے والے پیامات اس زمرے میں آتے ہیں۔ مثال کے طور پر:

- حب الوطنی: جس چیز کا اشتہار دیا جا رہا ہے، اس کی فروخت سے ملک کی صنعت ترقی کرے گی۔
- رومانس: شوہر کی طرف سے بیوی کو تحفے میں دی جانے والی کوئی شے۔
- مزاح: اشتہار میں کوئی مزاحیہ پہلو۔
- جذبہ وحمیت: بیا کمپنیوں کے بعض اشتہارات میں خود اعتمادی کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔

(ii) **منفی اپیلیں:** یہ اپیلیں عوام کو خطرناک چیزوں سے آگاہ کرتی ہیں۔ مثلاً ایڈس جیسے مہلک مرض کے بارے میں عوام میں بیداری پیدا کرنا، انکم ٹیکس محکمے کی جانب سے مقررہ وقت پر ٹیکس داخل کرنے کی اپیل اور نہ کرنے کی صورت میں تعزیراتی پہلوؤں سے باخبر کرنا، وغیرہ۔

اخلاقی اپیلیں: ان اپیلوں کا بہ کثرت استعمال عوامی خدمت کے اشتہارات میں ہوتا ہے مثلاً:

- انتخابات میں رائے دہندگان سے حق رائے دہی کے استعمال کی درخواست
- تیز رفتار سے گاڑیاں چلانے کے خلاف اپیل کرنے سے متعلق اشتہارات۔
- خاندانی منصوبہ بندی سے متعلق اشتہارات۔

پیام کا خاکہ:

اشتہارات میں دیے جانے والے پیام کے لیے مندرجۂ ذیل امور کا خیال رکھنا لازمی ہے:

- **ترتیب:** اشتہارات میں سب سے خاص بات سب سے پہلے کہی جائے، درمیان میں کہی جائے، اشتہار کے آخر میں ہو، اس کا فیصلہ اشتہار کو اثر انگیز بنانے کے حساب سے کیا جا سکتا ہے۔
- **نتیجہ اخذ کریں یا اسے ناظرین پر چھوڑ دیں:** اشتہارات کی ترتیب میں اس پہلو کا خیال بھی رکھا جانا چاہیے کہ اشتہارات کے پیام کو واضح انداز میں کیا جائے یا اسے ناظرین کی سمجھ پر چھوڑ دیا جائے۔ اخبارات و رسائل کے اشتہارات چوں کہ ناظرین کے ہاتھ میں ہوتے ہیں اور وہ اسے فرصت سے پڑھتے ہیں، اس لیے اشاروں میں باتیں کہی جا سکتی ہیں، جبکہ ٹیلی ویژن پر چونکہ چند ثانیوں میں تمثیلی منظر کشی کی جاتی ہے، اس لیے اشتہارات کا واضح ہونا زیادہ مناسب ہے۔
- **صرف مثبت پہلو بیان کیا جائے یا حقیقت پسندانہ رویہ ہو؟:** کچھ اشتہارات میں کسی شے یا خدمت کے متعلق صرف مثبت باتیں پیش کی جاتی ہیں اور کچھ اشتہارات میں قانونی لوازم کی وجہ سے منفی پہلو کا بھی ذکر شامل ہوتا ہے۔ مثلاً سگریٹ کے اشتہارات پر قانونی تنبیہ تحریر ہوتی ہے وہ یہ کہ اس کے استعمال سے نقصانات ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح سے شیئر بازار میں عوام سے سرمایہ لگانے کی اپیل کرنے کے ساتھ ساتھ کمپنی کے متعلق تمام معلومات کو غور سے پڑھنے کی صلاح

بھی دی جاتی ہے۔

○ **تکرار یا صرف ایک بار:** کچھ اشتہارات میں خاص بات کو ایک سے زائد بار دہرایا جاتا ہے۔ جب کہ اکثر اشتہارات میں ایک ہی بات کو دو یا اس سے زیادہ بار کہنے سے اجتناب کیا جاتا ہے۔

پیام کی پیش کش:

اشتہارات جب اخبارات و رسائل میں چھپتے ہیں، تو ان کی سرخیوں، تصاویر، فقروں، رنگوں کے استعمال اور اشتہاری نعروں پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔ اسی طرح سے ریڈیو کے اشتہارات میں آواز کے انتخاب، ادائیگی کے طریقے اور آواز کے تیز یا کم ہونے کے ساتھ ساتھ موسیقی کی آمیزش کی جاتی ہے۔ ٹیلی ویژن میں ریڈیو کے ان جملہ پہلوؤں کے ساتھ خوب صورت چہروں اور مناسب تمثیلی منظرکشی بھی شامل ہے۔ انٹرنیٹ پر Banner Ads کا چلن بہت عام ہے جس میں کسی شے یا خدمت کا اشتہار متحرک تصویر کی صورت میں ہوتا ہے۔ اسی تصویر پر کلک کرنے سے قارئین متعلقہ کمپنی کی ویب سائٹ پر جاسکتے ہیں اور مزید معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔

پیام کا پیش کنندہ:

اشتہارات کے کسی بھی پیام کے کامیاب ہونے کے لیے اس کے پیش کنندہ کا انتخاب بہت اہمیت رکھتا ہے۔ پیشہ ور اداکاروں اور ماڈلوں کے علاوہ کھلاڑیوں اور دیگر مشاہیر کا کسی اشتہار میں آنا اس کے پیام کی اثر انگیزی میں اضافہ کرتا ہے۔ اسی لیے دیا جاتی ہے کہ جب عمران خاں نے ایک چائے کے اشتہار میں 'سونے دیس واسطے سونی چائے' کا نعرہ لگایا تو وہ کس قدر کامیاب ہوا۔ اسی طرح سے استاد ذاکر حسین کا ''واہ تاج'' (چائے کا اشتہار) بھی بہت مقبول ہے۔

کامیاب اشتہار سازی کے لیے لازمی ہے کہ پیام کا مواد مناسب عقلی دلائل، جذباتی اپیل یا پھر اخلاقی اپیل پر مشتمل ہو۔ پیام کے خاکے کی تیاری میں جن امور کا خیال رکھا جانا چاہیے ان میں مواد کی ترتیب، پیام کا واضح انداز میں اشتہار کا مقصد ظاہر کرنا یا اسے ناظرین/قارئین کی صوابدید پر چھوڑ دینا، پیام میں صرف مثبت یا منفی پہلو کا اظہار کرنا، اشتہار میں کلیدی پیام کو صرف ایک بار کہنا یا تکرار سے کام لینا وغیرہ امور اہم ہیں۔ پیام کی پیش کش میں منتخبہ ذرائع ابلاغ کی مناسبت سے اشتہارات کی ہیئت طے ہوتی ہے جیسے پرنٹ میڈیا میں سرخی، تصاویر، رنگ کا استعمال یا سیاہ و سفید حروف میں تفصیلی بیان اور اشتہاری نعروں کا شامل ہونا وغیرہ ہے۔ اسی طرح سے ٹیلی ویژن میں مناظر پر اور ریڈیو میں آواز پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔ پیام کا پیش کنندہ وہ شخص ہے جو اشتہار میں کسی شے کو استعمال کرتے ہوئے یا خدمت سے استفادہ کرتا ہوا نظر آئے۔ عام طور سے ماڈل، فلمی اداکار، کھلاڑی، موسیقار حضرات اشتہارات میں اکثر نظر آتے ہیں کیوں کہ اس سے اشتہاری پیام مزید مؤثر ہو جاتا ہے۔ اشتہارات کی کامیابی اور اشتہاری پیام کی مقبولیت کے لیے متذکرہ موضوعات کی شمولیت لازمی ہے۔

□□□

House No. 3-5-805
Hyderguda, Raj Reddy Marg
Hyderabad-500029

دیوان حسرت عظیم آبادی

مرتبہ: ڈاکٹر اسما سعیدی

حسرت عظیم آبادی اپنے دور کے اہم شاعر تھے۔ ان کے کلام کا ایک انتخاب حسرت موہانی نے بھی شائع کیا تھا۔ یہ ان کا مکمل دیوان ہے جس پر فاضل مرتبہ نے اپنے مقدمے میں ان کی شاعرانہ خصوصیات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

صفحات: 484، قیمت: -/100 روپے

دکن میں اردو

مصنف: نصیرالدین ہاشمی

یہ کتاب دکنیات کے سلسلے میں ایک اہم مقام رکھتی ہے اور متعدد یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے۔ کتاب کے بعض بیانات سے بعد کے محققین نے جو اختلاف کیا ہے پیش لفظ میں مصنف کی جانب سے اس کی نشاندہی بھی کر دی گئی ہے۔

صفحات: 945، قیمت: -/202 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45% اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110 066

ندیم احمد

اسٹیفن ہاکنگ

فیسر اسٹیفن ولیم ہاکنگ (Fasser Stephen William Hawking) کا نام چند خواص کو چھوڑ کر عام ہندوستانیوں کے درمیان اتنا مقبول نہیں تھا لیکن جنوری 2001 میں اسٹیفن ہاکنگ کے ذریعے 88ویں سائنس کانگریس میں شرکت کے سلسلے میں ان کے ہندوستان کے سفر نے انھیں بے حد مقبولیت دلائی۔ ان کی اس مقبولیت کے پس پشت ایک سائنس داں ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی غیر معمولی کارکردگی کا نمایاں کردار رہا ہے۔ اپنی قوت ارادی، قوت تخیل اور اپنے تحمل سے شاندار کامیابی حاصل کر لینے والے اس عظیم سائنسداں کی پیدائش 8 جنوری 1942 کو آکسفورڈ، انگلینڈ میں ہوئی تھی۔ ان کے والد فرینک ہاکنگ (Frank Hawking) بھی ایک سائنسداں تھے جو گرم ملکوں میں ہونے والے امراض پر تحقیق کرتے تھے۔ اپنی اسی تحقیق کے سلسلے میں جب وہ لکھنؤ (ہندوستان) میں مصروف تھے تو اسی زمانے میں اسٹیفن ہاکنگ ان سے ملاقات کرنے انگلینڈ سے ہندوستان آئے تھے۔ تبھی سے وہ ہندوستان اور یہاں کی تہذیب و ثقافت کو دنیا کی بہترین اور خوبصورت تہذیب مانتے رہے ہیں۔ انھیں ہندوستانی ادب میں بھی گہری دلچسپی رہی ہے اور وہ تسلیم کرتے ہیں کہ وراثت کے معاملے میں ہندوستان دنیا کے دیگر ممالک سے کسی بھی طرح کم نہیں ہے۔

خود کو معذور، ذہین یا پاگل سائنسداں کہنے والے ہاکنگ کو بچپن میں خراب گھڑیوں کی مرمت کا شوق تھا۔ یہ محض اتفاق ہی ہے کہ آج 63 سال کی عمر میں بھی ہاکنگ کسی نہ کسی بہانے وقت کی پیچیدگیوں کو دور کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ انھوں نے وقت سے تعلق رکھنے والے تمام سوالات کے جوابات اپنی مشہور کتاب "A Brief History of Time" میں دینے کی کوشش کی ہے 1988 سے اب تک اس کتاب کی تقریباً دو کروڑ ستر لاکھ کاپیاں فروخت ہو چکی ہیں۔ اس کتاب کو دیگر زبانوں کے علاوہ ہندی میں بھی ترجمہ کر کے شائع کیا جا چکا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہاکنگ کی گہری دلچسپی کائنات سے وابستہ اہم راز کو عیاں کرنے میں بھی ہے اس موضوع پر ان کی نئی کتاب The Universe in a Nutshel بھی 2004 کے آخر میں آچکی ہے۔

پچھلے چالیس برسوں سے ہاکنگ کی زندگی ایک wheel chair تک محدود ہے جب 1959 میں ہاکنگ نے آکسفورڈ میں داخلہ لیا تو وہ بالکل صحت مند تھے لیکن 1963 میں وہ ایک لا علاج مرض کی گرفت میں آگئے امیوٹروفک لیٹرل اسکولروسن (Amoutrophic Letral Scullerosin) اس مرض نے انھیں ہمیشہ کے لیے معذور بنا دیا۔ اسی درمیان ان کی ملاقات Jenn Wild نام کی ایک خوبصورت لڑکی سے ہوئی اور انھوں نے ہاکنگ کی حوصلہ افزائی کی اور کہا کہ معذور ہو جانا زندگی کا اختتام نہیں ہے۔ 1963 میں دونوں نے شادی کر لی اور تین سال بعد ہاکنگ کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی۔

ہاکنگ کی شہرت و مقبولیت بے شمار آسمانی خلاؤں (Black Holes) پر ان کے ذریعے پیش کیے گئے انقلابی نظریات و بیانات کی وجہ سے ہوئی۔ انگلینڈ کے ہی جان میشیل (John Mischell) نے 1783 میں Black Holes کا تصور پیش کیا تھا انھوں نے خلا میں موجود ستاروں کو یا ایسے علاقوں کو سیاہ سوراخ (Black Holes) کا نام دیا تھا۔ اس تجربے کو ہاکنگ نے ایک نیا موڑ دیا ہے کہ تمام Black Holes سیاہ نہیں ہیں ان میں سے کچھ شعاعیں ضرور باہر نکلتی ہیں۔ ان شعاؤں کو اب "Hawking Rediations" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ہاکنگ کا کہنا ہے کہ Black Holes کی پہیلی (Puzzle) کو سلجھانے کے لیے Quantum Physics کا سہارا لینا ضروری ہے۔ ہاکنگ نے تحقیق کے ذریعے یہ ثابت کیا کہ کائنات میں اب تک جو کچھ بھی ہوا یا ہونے والا ہے وہ سب کچھ سائنسی اصولوں Scientific Principle کے عین مطابق ہے یہ بات ان کی کیتھولک بیوی جین (Jenn) کو پسند نہیں آئی اور ہاکنگ کی خانگی زندگی برباد ہو گئی۔ ہاکنگ سائنس کا دامن نہیں چھوڑا سکتے تھے اور Jenn کو اپنے مذہب پر اعتماد تھا اس لیے دونوں کے درمیان ازدواجی رشتے خراب ہو گئے اور بات طلاق تک پہنچ گئی۔

بہترین طبی سہولیات اور بہت کوششوں کے باوجود ان کی حالت لگاتار بد سے بدتر ہوتی گئی اس لیے انھوں نے اپنی Wheel Chair کو ہی اپنی دنیا بنا لی ان کی یہ Wheel Chair پوری طرح سے Auto Motorised ہے جسے وہ اپنی مرضی کے مطابق چلاتے ہیں اسی Wheel Chair پر ایک

جدید کمپیوٹر اور کمپیوٹر پر لکھی عبارت یا تحریر کو آواز میں تبدیل کر دینے والا Speech Sinthesizer لگایا گیا ہے۔ ہاکنگ اسی کی مدد سے بات چیت کرتے ہیں۔ یہ طریقہ بہت سست ہے اور اسٹیفن کی بات چیت کی رفتار تقریباً 13 الفاظ فی منٹ ہے اس کو بڑھانے اور تیزی لانے کے لیے ہاکنگ اور ان کے ساتھی ایک نیا سافٹ ویئر تیار کر رہے ہیں۔

کیمبرج میں ہاکنگ صبح 11 بجے اپنے دفتر میں آتے ہیں اور شام کو تقریباً آٹھ بجے تک یعنی آٹھ نو گھنٹے تک اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں۔ ان کے پاس جدید ڈیل کمپیوٹر ہے جس پر وہ انٹرنیٹ سے سرفنگ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے مداحوں اور دوست سائنسدانوں کے لیے ای میل بھی بھیجتے ہیں۔ ان کی اپنی ویب سائیٹ بھی ہے جس کا پتہ ہے۔ www.damtp.com.ac.uk/user-hawking اس کو انھوں نے خود بنایا ہے اور اپنے تمام Research paper اور Lecture وغیرہ وہ اسی پر دستیاب کراتے ہیں۔ اس وقت وہ اپنے چہرے کی کچھ نسیں اور بائیں ہاتھ کی صرف ایک انگلی ہی ہلا پاتے ہیں۔ اتنے مہلک اور موذی مرض میں مبتلا ہونے کے باوجود ہاکنگ کی محنت اور ان کے کام کرنے کا طریقہ سبق آموز ہے جو ہمیں بھی حوصلہ عطا کرتا ہے اور قوت فکر و عمل کی ترغیب دلاتا ہے۔

□□□

C-36/5 Lane No. 2
R.K. Marg, Chauhan Banger
Delhi-110053

حالی

مصنفہ: صالحہ عابد حسین

ایک شاعر، ادیب، نقاد، سوانح نگار کے ساتھ ساتھ مولانا الطاف حسین حالی ایک سماجی مصلح بھی تھے۔ انھوں نے نہ صرف مسلمانوں کی اصلاح کے لیے شاعری کا سہارا لیا بلکہ شعر و ادب کی کمزوریوں کی بھی نشان دہی کی اور اچھے اور معیاری ادب کی تخلیق کی ترغیب دی۔ صالحہ عابد حسین نے حالی کی شخصیت اور زندگی کے تمام گوشے اس کتاب میں اجاگر کیے ہیں۔

صفحات: 68، قیمت -/15 روپے

محمد حسین آزاد

مصنف: نند کشور وکرم

محمد حسین آزاد ہمارے ان اکابرین میں سے ہیں جنھوں نے اردو کی ادبی تاریخ کا رخ موڑنے میں اہم رول ادا کیا۔ انجمن پنجاب کے ذریعے انھوں نے جدید نظم کو فروغ دینے کے ساتھ آب حیات، دربار اکبری، نیرنگ خیال اور سخندان فارس جیسی اہم کتابیں بھی لکھیں۔ نند کشور وکرم نے اس کتاب میں آزاد کا بھرپور تعارف کرایا ہے۔

صفحات: 79، قیمت :-/18 روپے

اقبال کی کہانی

مصنف: جگن ناتھ آزاد

اقبال وہ عظیم شاعر اور فلسفی ہے جسے عالمی ادب کے منظرنامے میں اہم مقام حاصل ہے۔ شاعر اور فلسفی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ شگفتہ مزاج انسان بھی تھے۔ ان کی علمی اور ادبی بحثوں سے بڑے باریک نکتے، اسرار اور لطیفوں کے چمن زار کھلتے تھے۔ اقبال کو اپنے ملک و قوم کے بچوں کے مستقبل سے والہانہ لگاؤ بھی تھا جس کے سبب انھوں نے بچوں کے لیے مضامین لکھے اور خوب صورت نظمیں کہیں جنھیں پڑھ کر بچے اچھے شہری بن سکتے ہیں۔ ماہر اقبالیات جگن ناتھ آزاد نے اس کتاب میں اقبال کا جامع تعارف کرایا ہے۔

صفحات: 83، قیمت :-/11 روپے

جوش ملیح آبادی: شخصیت اور فن

مصنف: ظفر محمود

جوش ملیح آبادی اردو شعر و ادب کا ایک اہم نام ہے۔ انھوں نے نہ صرف شاعری کو خوب صورت زبان عطا کی بلکہ نثر میں بھی گل کاری کی ہے۔ ان کے شعر و ادب کے مطالعے سے خود اعتمادی، جوش اور اپنے ملک و تہذیب کی بقا کے لیے سینہ سپر ہونے کا پیغام ملتا ہے۔ نہ صرف ان کا فن بلکہ خود شاعر کی زندگی کے حالات اس پیغام کی بہترین ترجمانی کرتے ہیں۔ ظفر محمود نے ''جوش ملیح آبادی: شخصیت اور فن'' میں شاعر کی زندگی اور فن کے انھی گوشوں کو اجاگر کیا ہے جن سے نئی نسل کی ذہنی و علمی تربیت ہوتی ہے۔

صفحات: 105، قیمت -/38 روپے

نوٹ: طلبه کے لیے %45اور اساتذہ کے لیے %40کی خصوصی رعایت. تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا.

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔ 066 110

عبدالواحد

طبی لاپروائی اور قانون تحفظ صارفین 1986

طبی لاپروائی اگرچہ ایک قابل گرفت جرم ہے لیکن عدالت میں اس کو ثابت کرنا، ایک مشکل ترین امر ہے۔ سپریم کورٹ نے بھی اپنے حالیہ فیصلوں میں علاج اور طبی نگہداشت کے سلسلے میں انجام دی جانے والی خدمات میں کمی اور کوتاہی کی کئی شکایات کو ناقابل سماعت قرار دیتے ہوئے خارج کر دیا اور یہ کہتے ہوئے خاطی ڈاکٹروں کو بری کر دیا کہ ان کی چھوٹی موٹی (غیر ارادی) غلطی صرف ان کے ایک بشر ہونے کے ناطے نظر انداز کر دینے کے لائق ہے۔ بلکہ ناگہانی، غیر یقینی اور پیچیدہ حالات و واقعات کے پس منظر میں جو بعض اوقات ناقابل قیاس، ناقابو ہوتے ہیں کوئی چھوٹی سی غلطی، بدقسمتی سے اگر وقوع پذیر ہو جائے تو طبی پیشے کا ایک ناگزیر حصہ یعنی Partand Parcel قرار دی جا سکتی ہے۔ تاہم اگر مبینہ غلطی کا غیر ارادی نہ ہونا اگر ثابت کر دیا جائے تو بعض سنگین معاملات میں جیسے غلط یا جان لیوا دوا تجویز کر دینا یا نامناسب خوراک یا انجکشن دے دینا یا آپریشن کے عمل میں بے احتیاطی و بدانتظامی، متاثرہ حصے یا عضو کے بجائے صحت مند حصے یا عضو کا آپریشن اور مابعد آپریشن، نامکمل نگہداشت وغیرہ کو طبی لاپروائی و غفلت سے تعبیر کیا جائے گا اور خدمات کی انجام دہی میں کمی و کوتاہی قرار دے کر معقول و مصدقہ ثبوت کی بنیاد پر قابل دادرسی تسلیم کیا جائے گا۔ یہ حالات موجودہ یہ تمام مرحلے سر کرنا نہ صرف متاثرہ صارف و متعلقہ رشتے داروں کے لیے بلکہ تحریک صارفین کے موید ین کی رائے میں بھی ہمالیائی چوٹی سر کرنے کے مترادف ہے۔ طبی لاپروائی کے بارے میں مصدقہ ثبوت کا دستیاب ہونا کنزیومر فورموں کے وکلا کی رائے میں ایک اہم مسئلہ بن گیا ہے۔ ان کے مشاہدے کے مطابق ''آپسی بات چیت میں ڈاکٹر ہم سے کہتے ہیں کہ زیر بحث معاملہ بے شک طبی لاپروائی کا ہے لیکن عدالت میں اپنے ایک ہم پیشہ کے خلاف شہادت دینے یا زبانی بیان کی تصدیق کرنے سے انکار کرتے ہیں۔''

ڈاکٹروں کی اکثریت وکلا کو یہ اجازت دیتی ہے کہ ان کی زبانی اطلاعات کو ان کا نام لیے بغیر اور ان کو شہادت کے لیے عدالت میں طلب کیے بغیر وکلا اپنی بحث کو مدلل و مضبوط بنانے میں استعمال کر سکتے ہیں۔

وظیفہ یاب ڈسٹرکٹ اور سیشن جج جناب وینکٹ راؤ نے جو حیدرآباد ڈسٹرکٹ فورم کے صدر نشیں بھی رہ چکے ہیں کہا کہ ''طبی لاپروائی کو ثابت کرنے کے لیے کیوں کہ طبی ماہر کی رائے ایک قطعی اور فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے اس لیے ایسے معاملوں میں متعلقہ ماہرین کی رائے کی عدم دستیابی کے باعث اثبات جرم (Conviction) کی شرح بے انتہا کم ہے۔'' انھوں نے مزید صراحت کی کہ'' ماضی میں طبی لاپروائی کے کئی معاملات عدالت یا فورم سے رجوع کیے جاتے تھے۔ ایسے کئی متاثرہ افراد جو مقدمہ بازی کے متحمل ہو سکتے تھے بآسانی اور بلا روک ٹوک اپنی شکایات فورم میں دائر کرتے تھے۔ لیکن اب بدلتے ہوئے حالات میں جہاں سپریم کورٹ نے اپنے فیصلوں کے ذریعے کئی پابندیوں اور شرائط کی تعمیل کو لازمی قرار دیا ہے، طبی لاپروائی کے مقدموں کی تعداد، تجویز شدہ سخت شرائط کی عدم تکمیل کے باعث بے حد کم ہو گئی ہے۔ حتیٰ کہ ایسی شکایات کم و بیش جائز و حقیقی ہونے کے باوجود مذکورہ کڑی شرائط اور طویل اور صبر آزما طریقۂ کار کے باعث فورم تک پہنچنے سے محروم ہو گئی ہیں۔''

فورم کے سابق صدر کے مطابق: ''شاکی و ستم رسیدہ مریضوں کو لاعلمی اور ناتجربہ کاری کے باعث یہ نشاندہی کرنا مشکل ہوتا ہے کہ طبی غفلت و لاپروائی کا ارتکاب علاج کے کس مرحلے پر یعنی ماقبل علاج یا دوران علاج یا مابعد علاج کیا گیا۔ وہ تشخیص کا مرحلہ تھا یا حقیقی علاج و معالجہ یعنی ادویات، انجکشن یا آپریشن کی تجویز، استعمال و عمل آوری کا مرحلہ تھا یا مابعد علاج و سرجری، بشمول نگہداشت و ذیلی اثرات کا مرحلہ تھا۔ ایسے موقعوں پر ہی ایک مریض کو طبی لاپروائی ثابت کرنے کے لیے ایک ماہر طبی پیشہ ور کی رائے کی ضرورت پڑتی ہے۔''

ایک ڈاکٹر نے اپنا نام پردۂ خفا میں رکھنے کی شرط پر بتایا کہ: ''مریض بہت کم جھوٹ بولتے ہیں۔ مریضوں کی اکثریت زمانۂ قدیم سے معالج اور مریض کے رشتے کو ایک مقدس رشتہ مانتی ہے۔ جہاں معالج پر اعتقاد و اعتماد ہی علاج سے زیادہ اہم اور نصف بازیابی صحت کا ضامن ہے۔ اور جب وہ یہ کہتے ہیں کہ ایک ڈاکٹر نے غلط علاج کیا ہے تب ان کا قیاس اکثر معاملوں میں تقریباً صحیح ہوتا ہے۔ تاہم ڈاکٹر ان کے قیاس کو ایک وہم قرار دیتے ہوئے

انھیں تسلی و تسکین دیتے ہیں۔''

اس طرح ایک متاثرہ اور مفلوک الحال مریض کا علاج نامکمل، راحت عارضی اور بقیہ زندگی بے کیف ہو جاتی ہے۔ یعنی عملی طور پر'' آپریشن تو کامیاب ہوگیا لیکن مریض ادھ مواہو کر رہ گیا'' ایسے کئی ایک کیسوں میں ذیل کے حالیہ چند واقعات بطور ثبوت پیش کیے جاسکتے ہیں۔

پہلا معاملہ، جو 24 سالہ نازنین کی ابتلاو آزمائش اور سب کے لیے سخت حیرت و پریشانی کا باعث بنا، تب سے شروع ہوئی جب اس کا دردِ زہ ختم ہو گیا۔ میڈیکل ٹیم جس نے بچے کی پیدائش کے لیے اس کا Caesarean آپریشن انجام دیا، ٹانکے لگانے سے قبل ایک دستی تو ال (Mop) اس کے پیٹ سے نکالنا بھول گئی۔ نازنین تقریباً پانچ ماہ تک اس رستے ہوئے زخم اور درد کو سہتی رہتی اور اس نے درد سے افاقے کی بے شمار ادویات استعمال کیں۔ شنبہ 5 رفروری 2005 اس کے لیے اپنے مشکوک ومضطربانہ درد سے نجات پانے کا دن ثابت ہوا، جب باندرہ کے ایک ڈاکٹر نے اس کے رحم (Uterus) سے چھوٹی سی تو ال اور دھاگے کے کچھ تار نکالے۔ پالی نرسنگ ہوم (باندرہ) کی آپریشن انجام دینے والی ڈاکٹر زینت قاضی نے کہا کہ: '' اگر چہ اس کی عام صحت اب بہتر ہے لیکن پھر بھی اس کی افزائشی صلاحیت کا علاج ونگہداشت جاری ہے کیوں کہ ابھی اس کا رحم تکنیکی طور پر مکمل حالت معمول پر نہیں آیا۔ نازنین کے والد عبدالصمد صدیقی نے ڈاکٹر قاضی کو اپنی لڑکی کے لیے ایک نجات دہندہ قرار دیا۔ ان کے بیان کے مطابق ان کی لڑکی نے 8 ستمبر 2004 کو رائل نرسنگ ہوم میں جو کرلا میں اس کے مکان کے قریب واقع ہے ایک بچی کو جنم دیا۔ زچگی کے بعد 23 ستمبر 2004 کو جب سے اس نے نرسنگ ہوم چھوڑا تھا، وہ مسلسل درد کی شکایت کر رہی تھی۔ لیکن رائل نرسنگ ہوم کی ڈاکٹر کوثر خاں افاقے کے لیے مسلسل ادویات تجویز کرتی جا رہی تھیں۔

اتفاقاً ضلع بلرام پور (اتر پردیش) کے ایک دیہات (جو کہ ان کا پیدائشی وطن ہے) کے ڈاکٹر نے صدیقی سے کہا کہ ان کی لڑکی کے رحم میں دوران آپریشن کوئی بیرونی چیز چھوٹ گئی ہے۔ صدیقی کے مطابق '' ہم وہاں ایک شادی میں شرکت کے لیے گئے تھے۔ تب اس ڈاکٹر نے صرف معمولی طبی معائنے کے بعد درد کی اصل وجہ کی نشاندہی کی۔'' ممبئی واپس آنے کے بعد صدیقی نے 26 جنوری 2005 کو ایک بار پھر رائل نرسنگ ہوم سے رابطہ قائم کیا اور اپنے واقف کار ڈاکٹر کی زبانی رپورٹ سے آگاہ کیا لیکن ڈاکٹر کوثر خاں نے یہ اصرار کیا کہ نازنین دق میں مبتلا ہے جس کے باعث مواد جمع ہو گیا ہے اور یہ مسلسل درد اسی کا نتیجہ ہے۔ صدیقی نے تب یہ فیصلہ کیا کہ ایک اور معتبر رائے حاصل کی جائے اور اس کے لیے اس نے پالی نرسنگ ہوم کی ڈاکٹر زینت قاضی سے رابطہ قائم کیا جنھوں نے ابتدا میں ایک C.T. Scan نکلوایا جس سے یہ ظاہر ہوا کہ رحم میں ایک بیرونی شئے موجود ہے۔ تب ایک چھوٹا آپریشن انجام دیا گیا۔ ڈاکٹر زینت قاضی کے مطابق '' غلطی سے ایک دستی تو ال کا مریض کے جسم میں رہ جانا اور اس غلطی کی تشخیص میں اتنی تاخیر علاج کا ایک بدترین پہلو ہے۔'' ایک دوسرے ڈاکٹر نے جو اپنی شناخت ظاہر کرنا نہیں چاہتے، نشاندہی کی کہ اگر ڈاکٹر نے مریض کے ایکسرے نکلوائے ہوتے تو بیرونی اشیا (چھوٹی تو ال اور تار) کا بآسانی پتہ لگایا جاسکتا تھا۔ بلاشبہ یہ ایک طبی لاپروائی کا معاملہ ہے۔

لیلاوتی اینڈ ہولی فیملی ہاسپٹلس باندرہ کی کنسلٹنٹ گینا کولوجسٹ ڈاکٹر سی. کرن نے کہا کہ'' آپریشن کے دوران دستی تو الیں (Mops) آپریشن کے حصے کو چھوڑ کر دوسرے حصوں کو ڈھانپنے کے لیے یا آپریشن کے حصے کی نشاندہی کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔ تمام اسپتالوں میں یہ ایک معمول کا طریق کار ہے کہ ایک آپریشن کے لیے آپریشن روم یا آپریشن ٹیبل پر جانے والی ہر چیز کی، جیسے دستی تو الیں، سوئیاں اور دوسرے آلات کی لازماً قبل گنتی کی جاتی ہے بعد آپریشن، آپریشن شدہ حصے کو سینے یا بند کرنے سے قبل آپریشن روم میں لائی گئی ہر چیز کی دوبارہ گنتی کی جاتی ہے اور تمام چیزوں کا برابر حساب ملنے کی طمانیت کے بعد ہی شکم کو ٹانکے لگا کر بند کیا جاتا ہے۔''

زیر بحث معاملے میں نازنین کے شکم میں دستیاب شدہ دستی تو ال اور تار اب پولیس کی تحویل میں ہے۔ صدیقی نے کرلا پولیس اسٹیشن میں شکایت درج کروائی جہاں بطور ثبوت ان اشیا کا اندراج کر لیا گیا ہے۔ پی. آر. ساتم، سینئر پولیس انسپکٹر نے کہا کہ'' متعلقہ ڈاکٹر سے جس کا نام شکایت میں دیا گیا ہے، تحریری بیان لینے کے بعد ہی FIR تیار کی جائے گی۔'' ڈاکٹر کوثر خان جو کرلا میں تقریباً 12 سال سے پریکٹس کر رہی ہیں، اپنا نقطۂ نظر ظاہر کرنے کے لیے دستیاب نہیں تھیں۔ اس طرح معاملہ اب فی الحال پولیس کے دائرۂ اختیار میں ہے۔

ایک دوسرے معاملے میں تحریک صارفین کے ایک سرگرم کارکن این. گنیشم کو ایک شادی شدہ جوڑے کی جانب سے ایک شکایت وصول ہوئی جس میں انھوں نے ایک گینا کولجسٹ (ماہر امراضِ نسوانی) پر طبی لاپروائی کا یہ الزام لگایا تھا کہ ڈاکٹر نے بیوی کے جسم سے دوران آپریشن متاثرہ بیضہ دان (Ovary) کے بجائے ایک صحت مند بیضہ دان نکال دیا تھا۔ بیوی اور شوہر کے

پاس ان کے ادعا کی تائید میں تمام دستاویزات (آپریشن سے پہلے اور بعد میں انجام دیے گئے معائنے کی رپورٹیں) موجود تھیں لیکن ایک مشکل مسئلہ جو ان کی راہ میں اہم رکاوٹ بن گیا تھا وہ یہ تھا کہ کوئی ماہر طبی پیشہ ور اس غلطی کی تحریری تصدیق کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ بیوی، ایک 34 سالہ خاتون کئی ایک عجیب وغریب مخمصوں اور تفکرات میں پھنسی ہوئی تھی۔ اس کو یہ خدشہ لاحق تھا کہ کہیں قبل از وقت مینو پاز (Menopause) (ماہواری کے بند ہونے) کا آغاز نہ ہو جائے۔ کہیں متعلقہ ہڈی یا ہڈیاں غیر معمولی طور پر نرم یا ملائم (Osteoporosis) نہ پڑ جائیں یا طویل Hormone Replacement Therapy (HRT) کا سلسلہ شروع نہ ہو جائے۔

میاں بیوی دونوں نے مشہور اسپتالوں کے ڈاکٹروں بشمول ماہرین نسوانی امراض اور سینئر ریڈیالوجسٹس سے مشورہ کیا اور ان سب نے دوران گفتگو زیر بحث معاملے کے "طبی لاپروائی کا ایک سنگین معاملہ" ہونے کی زبانی تصدیق کی لیکن کوئی بھی اس تصدیق کو تحریر میں دینے کے لیے رضا مند نہیں ہوا۔ سب کا ایک ہی جواب تھا کہ آپ ہم سے صلاح ومشورہ کر سکتے ہیں یا ہماری رائے جان سکتے ہیں لیکن ہم غلطی (طبی لاپروائی) کی تحریری توثیق نہیں کر سکتے۔ ماہرین کے اس طرح کے مہمل جواب سے دونوں فی الحال مایوس و مغموم ہیں۔ اور فورم یا عدالت کے ذریعے آگے کی قانونی کارروائی کے آغاز کے لیے تحریری اور ٹھوس ثبوت کی عدم موجودگی میں، پس وپیش میں مبتلا ہیں۔

ایک اور معاملے میں ودیا ساگر انسٹی ٹیوٹ آف مینٹل ہیلتھ اینڈ نیورو سائنس (ویمہنس Vimhans) نے ایک مریض کو مبینہ طور پر غلط دوا استعمال کرادی جس کے باعث اس کا دایاں ہاتھ اتنا پھول اور پھیل گیا کہ اس کو جسم سے علاحدہ کر دینا پڑا۔ اسپتال کے خلاف طبی لاپروائی کا ایک کیس رجسٹر کر لیا گیا۔ مریض کو اب فی الحال آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنس کے ایمرجنسی وارڈ میں زیر مشاہدہ رکھا گیا ہے۔

43 سالہ منی دیوی بھرتوال، لینڈس ڈونے میں کیندریہ ودیالیہ کی ایک ٹیچر 30 نومبر 2004 کو ایک جزوی فالج کے حملے سے متاثر ہوئی اور اس کے پیروں کے دونوں پنجے بے حس و بے جان ہو گئے۔ اس کو فوری طور پر دہلی لایا گیا اور ویمہنس کے ایمرجنسی وارڈ میں داخل کروایا گیا۔ منی دیوی کے شوہر سمن چندرا بھرتوال نے جو لینڈس ڈونے میں ایک سرکاری ملازم ہے بتایا کہ "4 دسمبر 2004 کی رات سے بیوی کے ہاتھ میں سوجن اور تکلیف شروع ہوئی۔ ہم نے ڈیوٹی پر موجود جونیئر ڈاکٹروں کو فوراً اس کی اطلاع دی۔ جنھوں نے کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ بالکل نارمل ہے لیکن منی دیوی کا ہاتھ غیر معمولی سوجن اور اندرونی جلن سے اتنا متاثر ہو گیا کہ 20 دسمبر 2004 کو ہاتھ قلم کر دینا پڑا۔ اس تمام مدت کے دوران اس کا اصل مسئلہ یعنی اس کے پیروں کے پنجوں کی بے حسی اور سُن پنا پہلے کی طرح ہی برقرار رہا۔

اسپتال کے انتظامیہ نے بھرتوال سے وعدہ کیا کہ وہ کوئی فیس چارج نہیں کریں گے کیوں کہ جو بھی ہوا وہ ان کی غلطی تھی۔ انھوں نے مزید یہ بھی کہا کہ وہ اپنی جانب سے دو لاکھ روپے کے خرچ پر اس کو ایک مصنوعی ہاتھ لگا دیں گے اور مناسب معاوضہ بھی دیں گے۔ تاہم 7 فروری 2005 کو جب مریض نے اسپتال چھوڑنے کا فیصلہ کیا تو اسپتال انتظامیہ نے 'بقول مریض' کے اس سے 4 لاکھ روپے کا بل ادا کرنے کے لیے اصرار کیا۔

منی دیوی بھرتوال کے مطابق: "معاملے کو انتہائی حد تک چوپٹ کرنے اور مجھے معذور بنانے کے بعد اپنی غلطی کے لیے، جس کو وہ تسلیم کر چکے تھے، اب مجھے بل کی ادائگی کرنے کے لیے کہہ رہے تھے۔ میں اس لمحے اتنی مایوس اور بے بس ہو گئی تھی کہ سوائے خودکشی کرنے کے مجھے کوئی دوسرا راستہ نہیں سوجھ رہا تھا۔" جب ہم نے چار لاکھ روپے ادا نہیں کیے تو اسپتال انتظامیہ نے ہمیں اسپتال چھوڑنے سے روک دیا۔" بھرتوال کی شکایت پر معاملہ پولیس میں رجسٹر کیا گیا۔

تاہم اسپتال انتظامیہ نے یہ کہتے ہوئے الزام سے انکار کیا کہ "مریضہ کا ہاتھ کچھ پیچیدگی کے باعث قلم کر دینا پڑا نہ کہ ہماری جانب سے کسی لاپروائی کے باعث۔ وہ ریڑھ کی ہڈی کے عارضے سے متاثر تھی۔ اس کے علاوہ اس کو غدودوں کی صلاحیت کا متاثر ہونا، مسلسل ہائی بلڈ پریشر کا رہنا اور امکانی طور پر ریڑھ کی ہڈی کا غیر معمولی ابھار جیسی شکایات لاحق تھیں۔ جس کے باعث اس کے دائیں بازو کی ہڈیاں گل گئیں اور مفلوج ہو گئی تھیں۔ اس لیے ہمیں اس کا دایاں بازو قطع کرنا پڑا۔ اگر ہم ایسا نہ کرتے تو پہلے گینگرین اور بعد میں خون میں زہر پیدا ہونا شروع ہو جاتا اور نتیجتاً مریضہ ہلاک ہو جاتی۔"

ڈاکٹر آر. پی. اروڑا، ویمہنس کے چیف ایڈمنسٹریٹر نے کہا کہ "ان کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ وہ ادائگی کرنا نہیں چاہتے۔ لیکن مریضہ کا ادعا یہ تھا کہ ان تمام بیماریوں کی نشاندہی دورانِ تشخیص یا علاج کے دوران جو تقریباً دس مہینے جاری رہا کیوں نہیں کی گئی اور کیوں ہمیں ان اہم معلومات سے بے خبر رکھا گیا۔ ان کا تذکرہ معاملے کے پولیس کیس بن جانے کے بعد کرنا، اپنا ناجائز دفاع کرنے کے مترادف ہے۔ جس مرض کے لیے مریض کو اسپتال میں داخل کروایا گیا تھا اس کا مداوا تو نہیں ہو سکا اور وہ جیسا کا ویسا برقرار ہے، اور جن امراض کی فہرست، تقریباً دس ہفتے بعد بوجہ تنازعہ مطلوبہ رقم کی عدم

ادائیگی پر اور وہ بھی بوقت ڈسچارج ہم کو بتائی جا رہی ہے، اس کا اصل مرض سے بظاہر کوئی تعلق ہی دکھائی نہیں دیتا۔ بہرحال چونکہ معاملہ اب ایک طرف پولیس اور دوسری طرف AIIMS میں زیر تفتیش ہے اس لیے فی الحال تنازعے کے نتیجے کے ساتھ ہی ساتھ مریض کی بازیابی صحت کا انتظار ہی بہتر ہے۔"

آخر میں ایک اور معاملہ — شہر حیدرآباد کی چادر گھاٹ پولیس نے ایک شخص کی اس شکایت کی بنیاد پر کہ ادویات کی ایک بھاری خوراک کے باعث اس کی آٹھ برس کی بیٹی غیر معمولی موٹاپے کا شکار ہوگئی، دو ڈاکٹروں کے خلاف لاپروائی کا ایک مقدمہ درج کیا۔ سرپرست کے مطابق انھوں نے اپنی بیٹی کو جو شدید سر درد سے دوچار تھی، مقامی اسپتال میں دکھایا، ڈاکٹر نے لڑکی کی بیماری کی تشخیص کے بعد دوا دی۔ لیکن دوا کے استعمال کے بعد بھی لڑکی کی تکلیف بدستور قائم رہی جس پر مذکورہ ڈاکٹر نے سرپرست کو ایک کلینک کے ڈاکٹر سے رابطہ قائم کرنے کی صلاح دی۔

آخر الذکر ڈاکٹر نے بھی کچھ دوائیں دیں۔ لڑکی کے والد کے بیان کے مطابق: "دونوں ڈاکٹروں کی تجویز کردہ دواؤں کے استعمال سے لڑکی غیر معمولی طور پر موٹی ہوتی گئی۔ میں نے تقریباً -/50,000 روپے لڑکی کے علاج پر صرف کیے۔ بعد میں ایک تیسرے ڈاکٹر سے رابطہ قائم کیا گیا جس نے کہا کہ ادویات کی بھاری خوراک اور زیادہ استعمال کے باعث لڑکی موٹاپے کا شکار ہو گئی ہے۔" دواؤں کا استعمال بند کرنے کے بعد لڑکی کی صحت بتدریج معمول پر لوٹ آئی۔

تاہم اول الذکر ڈاکٹر نے ان الزامات کی تردید کی اور کہا کہ "لڑکی کا مناسب علاج کیا گیا تھا۔ نہ میری جانب سے اور نہ دوسرے ڈاکٹر کی جانب سے کوئی لاپروائی کی گئی۔ اسپتال سے ڈسچارج کرتے وقت لڑکی بالکل نارمل تھی۔"

چادر گھاٹ پولیس اسٹیشن کے سب انسپکٹر ساهد یو سنگھ نے کہا کہ "معاملہ میڈیکل بورڈ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ اگر کسی لاپروائی کا ارتکاب کیا گیا ہے تو ڈاکٹروں کو حراست میں لیا جائے گا۔" اس طرح یہ معاملہ بھی پولیس کے زیر غور ہے۔

❑❑❑

17-2-312/A, Kurmaguda
P.O. Saidabad, Hyderabad-59

انیس کے مرثیے

مرتبہ: بیگم صالحہ عابد حسین

میر انیس کے مرثیوں کے متعدد مجموعے شائع ہوئے ہیں لیکن یہ ان کے پورے کلام کو محیط نہیں اور ان میں بیشتر میں صحت متن کا بھی زیادہ خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ یہ کتاب بیگم صالحہ عابد حسین نے تدوین کے جدید اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے دو جلدوں میں مرتب کی ہے جس میں انیس کے تمام دستیاب مرثیے شامل ہیں۔ ہر جلد کے ساتھ مفصل مقدمہ بھی ہے اور ایسے الفاظ کی فرہنگ بھی جو اب کم مستعمل ہیں یا معنوی تغیر سے دوچار ہوئے ہیں۔

جلد اوّل، دوسرا ایڈیشن: صفحات: 540، قیمت: -/36 روپئے

جلد دوم، دوسرا ایڈیشن: صفحات: 575، قیمت: -/40 روپئے

کاشف الحقائق

مصنف: سید امداد امام اثر

سید امداد امام اثر کی یہ بلند پایہ تصنیف دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں یوروپی ادبیات کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے اور دوسرے حصے میں مشرقی ادبیات کی خصوصیات واضح کی گئی ہیں۔ شعر و ادب اور دیگر فنون لطیفہ میں جو باہمی قربت و موانست ہے، اس کا بھی ذکر ہے۔ دوسرے حصے میں اردو شاعری کی تمام اصناف اور ہر صنف کے نمائندہ شاعروں کا تفصیلی بیان ہے جو تجزیاتی انداز کا حامل ہے۔ اس ایڈیشن کی ایک خصوصیت پروفیسر وہاب اشرفی کا بسیط مقدمہ ہے جس میں انھوں نے کتاب کے تمام اہم پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔

دوسرا ایڈیشن: صفحات: 740، قیمت -/145 روپئے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45% اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔
تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، وِنگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110 066

تحریر: صادق ہدایت
ترجمہ: ممتاز احمد

داش آکُل

صادق ہدایت ایران کے ایک مشہور افسانہ نگار تھے جنھوں‌نے فرانس اور ہندوستان میں‌کئی سال گزارے۔ وہ دوران تعلیم مغربی انداز فکر وتحقیق سے بھی آشنا ہوئے اور جدید مصنفین کے جدید مکتب فکر کا بھی مطالعہ کیا۔ اس مطالعے اور تعلیم کااثر ان کی طرز نگارش پر پڑا۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ وہ انگریزی ، فرانسیسی اور پہلوی زبانیں بھی جانتے تھے۔ انھیں ہندوستان کے آداب ورسوم سے بھی دلچسپی تھی۔ وہ مہاتما بدھ کے تصور عرفان ونروان سے بہت متاثر تھے اور اسی کے زیر اثر انھوں‌نے فواید گیا خوری(سبزی خوری کے فوائد) تصنیف کی۔صادق ہدایت بڑے وطن پرست تھے۔ انھوں‌نے اپنے افسانوں میں ایرانی سماج کی خوبیوں، خامیوں اورقومی اخلاق کی عکاسی کی ہے۔صادق ہدایت کے افسانوں کے چند مجموعے یہ ہیں۔ سہ قطرہ خون، زندہ بگور، سایۂ روشن، سگ دلگرد وغیرہ۔ سہ قطرہ خون صادق ہدایت کے گیارہ افسانوں کا مجموعہ ہے جس کا ایک اہم افسانہ ''داش آکُل'' ہے۔ یہ ایک عالی ہمت اور ایثار پسند آدمی کی کہانی ہے جو دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ یہ کہانی قارئین ''اردو دنیا'' کی نذر ہے۔

شیراز کے بھی لوگ اس بات سے واقف تھے کہ داش آکل اور کاکا رستم دونوں ایک دوسرے کے سائے سے بھی نفرت کرتے تھے۔ ایک دن داش آکل چائے خانے کی طرف روانہ ہوا جو وہاں سے قریباً دو میل دور واقع اس کا پرانا اڈہ تھا۔ وہ اس وقت اپنے کاندھے پر اونی چادر اوڑھے ہوئے تھا جس کی شکل بار بار ہاتھ پھیرنے سے بے رنگ ہو چکی تھی۔ وہ چائے خانے میں پہنچ کر اپنی انگلی کے ذریعے وہاں برتن میں رکھے برف کو گھمانے لگا کہ اتفاق سے اس وقت کاکا رستم اس جگہ نمودار ہوا اور داش آکُل پر حقارت بھری نگاہ ڈالی اور اپنے ہاتھ کو کاندھے پر رکھتے ہوئے داش آکل کے سامنے بیٹھ گیا اور اپنا رخ چائے خانے کے بَیرے کی طرف موڑتے ہوئے کہا:

''اے بچے چائے لاؤ۔''

داش آکل نے بیرے پر ایک معنی خیز نگاہ ڈالی اس طور سے کہ وہ اپنا کام اسی طرح کرتا رہا جیسے اس نے کاکا رستم کی بات کو سنا ہی نہیں۔ وہ چھوٹے سے گلاس سے چاول سے بنی شراب کو نکال کر اس میں پانی ملاتا رہا۔ شراب میں پانی ملانے سے شیشے کے گلاس سے خرخرانے کی آواز ہو رہی تھی۔

کاکا رستم داش آکُل کی اس حرکت سے بہت خفا تھا، اس نے دوبارہ بیرے کو زور سے آواز دی۔

''اے لڑکے نافرمانی نہ کرو۔ چائے لاتے ہو یا نہیں۔''

بیرے نے مسکراتے ہوئے داش آکل کی جانب نگاہ ڈالی تو کاکا رستم نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''اے لڑکے بہرے ہو کیا؟ اونچا سنتے ہو؟ بڑے بدتمیز ہو؟ کیا آج ہی آئے ہو یا تمھارے ہاتھ پاؤں کمزور ہو گئے ہیں؟

داش آکل جو برتن میں برف کو گھما رہا تھا اور اپنی نگاہ نیچے کیے ہوئے تھا، مسکرایا اور بولا:

''بے غیرت لوگ ہمیشہ بڑھ چڑھ کر بولتے ہیں اور اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ رستم کے غصے اور آفندی کے بڑھاپے میں کیا فرق ہے۔''

چائے خانے میں موجود بھی لوگ کاکا رستم کی بات پر ہنس پڑے۔ داش آکل شہر کی ایک مشہور شخصیت تھا اور اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں اگر لوگوں کو اس سے نقصان نہ پہنچا ہو۔ ہر رات ملا اسحٰق یہودی کے گھر ایک پر جوش بحث ہوا کرتی تھی اور لوگ محلّہ سردزک میں جمع ہو جاتے تھے۔ کاکا رستم اگر غصہ بھی ہوتا تو اپنے آپ کو قابو میں رکھتا اور وہ اس بات سے اچھی طرح واقف تھا کہ وہ میدان میں داش آکل کا مقابلہ کرنے کے لائق نہیں ہے۔ چونکہ وہ دو بار داش آکل کے ہاتھوں زخمی ہو چکا تھا اور تین چار بار داش آکل اس کے سینے پر بیٹھ چکا تھا۔ خوش قسمتی سے چند رات پہلے کاکا رستم نے میدان خالی دیکھا اور خوب اچھلنے کودنے لگا۔ اتفاق سے داش آکل بھی موت کے فرشتے کی طرح وہاں آ پہنچا اور کاکا رستم پر برس پڑا اور اس سے کہا:

''اے کاکا! یہ محلہ کوئی مردہ خانہ نہیں۔ تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہاں کے لوگ ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ تم نے بہت اچھل کود مچا لی۔ جانتے ہو تمھاری حرکت تمھاری بے غیرتی کی دلیل ہے۔ ایسی ڈینگ بازی سے باز رہو۔ ہر جگہ تمھیں لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے لیکن قسم سے اگر دوبارہ تم نے بدتمیزی کی تو تیری مونچھیں اکھاڑ لوں گا اور اسی چاقو سے تمھیں دو ٹکڑے کر دوں گا۔''

اس وقت تو کاکا رستم نے صبر سے کام لیا اور وہاں سے چل پڑا لیکن اس کے دل میں داش آکل کے تئیں شدید نفرت پیدا ہوگئی اور وہ اس سے بدلہ لینے کے بہانے تلاش کرنے لگا۔

دوسری جانب داش آکل کو شیراز کے سبھی لوگ عزیز رکھتے تھے کیونکہ وہ محلہ سرِ دزک کی نگرانی کرتا تھا۔ وہ نہ صرف عورتوں اور بچوں کا محسن اور مددگار تھا بلکہ تمام لوگوں کے ساتھ مہربانی سے پیش آتا تھا۔ محلے کے تمام لوگوں سے داش آکل کی صاحب سلامت بھی تھی۔ اکثر و بیشتر داش آکل لوگوں کی دستگیری بھی کرتا تھا اور اگر کہیں فساد ہو جاتا تو وہ لوگوں کو گھر تک پہنچاتا تھا۔

لیکن وہ خود اپنے تئیں بے حد لاپرواہ تھا۔

کاکا رستم نے ایک دن تین مثقال (1 مثقال 5 گرام وزن) افیم کھالی اور ہزاروں طرح کے ڈھونگ کرنے لگا۔ کاکا رستم اس تحقیر سے چائے خانے میں بیٹھا تھا اور بہانہ ڈھونڈ رہا تھا کہ اس وقت اگر اسے چاقو سے مارا جاتا تو ایک قطرہ خون بھی نہ نکلتا۔ وہ کچھ دیر کے بعد چلاتے ہوئے لوگوں کی جانب مڑا جہاں سبھی لوگ پرسکون انداز میں بیٹھے تھے۔ چائے خانے کا بیرا جو سیاہ ٹوپی پہنے اور چیکیلی شلوار کو ہاتھ سے پکڑے ہوئے، اپنی ہنسی کو دبائے ہوئے بیٹھا تھا۔ وہاں زیادہ تر لوگ کاکا رستم کی حرکتوں پر ہنس رہے تھے۔ کاکا رستم چائے خانے میں داخل ہوا۔ اس نے اپنے ہاتھ سے شیشے کی چینی کی پیالی اٹھایا اور اسے بیرے پر دے مارا لیکن وہ چینی کا پیالہ چائے کی دیگچی سے جا ٹکرایا اور زمین پر گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ اس کے بعد کاکا رستم چائے خانے کے باہر چلا گیا۔

آہستہ سے بڑبڑاتے ہوئے بیرا پریشانی کی حالت میں ٹوٹے ہوئے سامانوں کو جمع کرنے لگا۔

لیکن چونکہ اسے رستم کا خوف تھا اس لیے زبردستی مسکرایا۔ چائے خانے کے مالک نے بیرے کو مارنا چاہا لیکن داش آکل نے اپنی جیب سے روپے کی ایک تھیلی نکالی اور چائے خانے کے مالک کے سامنے رکھ دیا۔ چائے خانے کے مالک نے روپے کی اس تھیلی کو ہاتھ میں اٹھایا، اس کے وزن کا اندازہ کیا اور مسکرایا۔ اسی وقت ایک شخص مخمل کی تھیلی لیے، ڈھیلی شلوار پہنے اور سر پر ٹوپی لگائے چائے خانے میں داخل ہوا اور چاروں طرف نگاہ ڈالتے ہوئے داش آکل کے سامنے آیا، سلام کیا اور بولا۔

''حاجی صمد کا انتقال ہوگیا ہے۔''

داش آکل نے اپنا سر اٹھایا اور بولا ''خدا کی جو مرضی۔''

''مگر آپ نہیں جانتے کہ انھوں نے کیا وصیت کی ہے۔''

میں مردہ خور نہیں ہوں۔ جائیے اور مردہ خوروں کو خبر کیجیے۔

''آخر آپ کو انھوں نے اپنا وکیل اور کارگزار مقرر کیا ہے۔''

اس بات کو سن کر داش آکل کا دل پارہ پارہ ہوگیا۔ اس نے دوبارہ سر سے پیر تک اس آدمی پر نظر ڈالی اور اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرا اور اپنے سر سے ٹوپی اتاری جس سے اس کی پیشانی کی بدلی ہوئی رنگت ظاہر ہوئی۔ اس کی آدھی پیشانی سیاہ ہو چکی تھی اور آدھی پیشانی جو ٹوپی سے پوشیدہ تھی سفید تھی۔ اس نے اپنا سر ہلایا اور اپنا ہاتھ بڑھا کر اس آدمی کے سر کو آہستگی سے تھپتھپایا اور تسلی دیتے ہوئے بولا۔

''خدا نے حاجی کو بلا لیا، وہ گزر گئے لیکن کوئی اچھا کام نہ کیا۔ تم نے مجھے غمگین کیا۔ اچھا تم جاؤ، میں آتا ہوں۔''

داش آکل کے پاس جو شخص آیا تھا وہ حاجی صمد کا وکیل تھا، وہ تیز قدموں سے واپس چلا گیا۔ داش آکل بے حد اداس ہوگیا۔ اچانک چائے خانے کے اس خوشگوار ماحول میں ایک کالی گھٹا چھا گئی۔

جس وقت داش آکل حاجی صمد کے گھر پہنچا اس وقت وہاں تمام کام مکمل ہو چکا تھا اور صرف چند لوگ، مولوی اور دوسرے رشتے دار کشمکش میں تھے کہ چند لمحہ سانس لینے کے بعد داش آکل ایک بڑے کمرے کی جانب گیا جس کا دروازہ باہر کی جانب کھلتا تھا۔ وہاں ایک خاتون پردے کے پیچھے تشریف فرما تھی۔ داش آکل نے انھیں سلام کیا اور مختصراً تعارفی گفتگو کے بعد ان کی جانب رخ کر کے بیٹھ گیا اور کہا:

''خانم آپ ہمیشہ سلامت رہیں۔'' خانم نے رندھی ہوئی آواز میں کہا:

جس رات حاجی صاحب کی حالت خراب ہوئی تو امام صاحب کو ان کی تیمارداری کے لیے بلایا گیا۔ حاجی صاحب نے امام صاحب اور سبھی لوگوں کے سامنے آپ کو اپنا وکیل اور کارگزار مقرر کیا۔ یقیناً کیا آپ حاجی صاحب کو پہلے سے جانتے تھے؟

''ہم لوگ پانچ سال قبل ایک سفر میں ایک دوسرے سے آشنا ہوئے تھے۔''

''حاجی صاحب ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ اگر ایک آدمی جواں مرد ہے تو وہ فلاں ہے۔''

''خانم میں اپنی آزادی کو سبھی چیزوں سے زیادہ پسند کرتا ہوں لیکن چونکہ شریف النفس انسان گذر چکے ہیں اس لیے ان کی باتوں کو سر آنکھوں پر رکھنا

چاہتا ہوں۔''

اس کے بعد داش آکل نے جیسے ہی ادھر اپنا رخ کیا، پردے کی دوسری جانب ایک لڑکی کو دیکھا جس کا چہرہ زرد اور آنکھیں سیاہ تھیں۔ ایک لمحے کے بعد داش آکل نے دوبارہ اپنی نگاہ اس لڑکی کی جانب کی لیکن اس لڑکی نے شرم سے پردہ گرا دیا اور پیچھے ہٹ گئی۔ یہ لڑکی پھول کی طرح حسین تھی! بہر حال اس نگاہ نے اپنا کام کیا اور داش آکل پر گہرا اثر ڈالا۔ داش آکل کی حالت بدل گئی۔ اس نے اپنا سر پیچھے کیا اور چل دیا۔

یہ مرحوم حاجی صمد کی بیٹی تھی جس کا نام مرجان تھا۔ وہ داش آکل کو دیکھنے آئی تھی کیونکہ وہ اس شہر میں بہت مشہور تھا اور اب وہ خود اس کے گھر آیا تھا۔

داش آکل اس دن کے بعد سے حاجی صمد کے کاموں میں مشغول ہوگیا۔ اس نے ایک سامان فروش، دو چوکیدار اور ایک منشی کی مدد سے حاجی صاحب کی تمام چیزوں کی فہرست تیار کی۔ جو چیزیں زیادہ تھیں، انھیں مہر بند کیا اور جن چیزوں کی ضرورت تھی اسے خریدا۔ کچھ ضروری کاغذات کو پڑھنے کے لیے طلبہ کو بلایا۔ ان تمام کاموں کی انجام دہی میں اسے دو دن اور دو راتیں لگیں۔ تیسری رات داش آکل خستہ حال صورت میں حاجی صاحب کے گھر کی جانب روانہ ہوا۔ راہ میں اس کی ملاقات امام قلی چلنگر سے ہوئی۔ اس نے بتایا کہ دو رات قبل کاکا رستم راہ میں ملا تھا، وہ کہہ رہا تھا کہ اس نے کئی دنوں سے اپنے اچھے دوست کی نہ آواز سنی اور نہ اسے دیکھا۔

داش آکل نے ان باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا: یہ سب خیالی باتیں ہیں۔ اسے اپنے پاس رکھو۔ داش آکل کو اچھی طرح یاد تھا کہ تین دن قبل ہی کاکا رستم سے چائے خانے میں اس کی نوک جھونک ہوئی تھی۔ داش آکل نے چاہا کہ کاکا رستم اور امام قلی کو سبق سکھائے لیکن اس وقت اس نے اس کی باتوں کو نظر انداز کر دیا اور اپنے آپ پر قابو رکھتے ہوئے چلا گیا۔ راستے میں اس کے دل و دماغ میں صرف مرجان کی صورت بسی ہوئی تھی۔ اس نے بہت کوشش کی کہ اس کی صورت کو اپنی آنکھوں سے دور کر دے لیکن وہ اور بھی زیادہ اس کی نگاہوں میں پیوست ہوتی چلی گئی۔

داش آکل ایک پینتیس سالہ تندرست آدمی تھا لیکن وہ بہت بدصورت تھا اور جو کوئی بھی ایک بار اسے دیکھتا تھا وہ اپنی نگاہ کے ذوق کو ختم کر لیتا تھا لیکن جب کوئی آدمی اس کی صحبت میں بیٹھتا تھا یا اس کی زندگی کا کوئی واقعہ سنتا تھا تو وہ اس پر نثار ہو جاتا تھا اور اس کے چہرے پر جو گہرے نشانات تھے ان پر اس کی نگاہ نہیں جاتی تھی۔ داش آکل ایک سیدھا سادا اور متاثر کرنے والا انسان تھا۔ سرخ آنکھیں، کالے اور لمبے بال، چوڑی گال، نوکیلی ناک لیکن زخموں کے نشانات نے اسے خراب بنا رکھا تھا۔ اس کی شکل اور پیشانی پر ہر جگہ گہرا زخم تھا جو بدنما معلوم ہوتا تھا۔ اس کی بائیں آنکھ کے نچلے حصے میں ایک گہرا نشان تھا جو سب سے زیادہ بدنما معلوم ہوتا تھا۔

اس کے والد ایران کے بڑے زمینداروں میں سے ایک تھے۔ ان کے پاس جو کچھ تھا وہ ساری چیزیں ان کے عقلمند بیٹے کی وراثت میں آئیں۔ داش آکل ایک وسیع الذہن اور فراخ دل انسان تھا، وہ دنیا کے مال و اسباب کو اہمیت نہیں دیتا تھا۔ اسے اپنی زندگی میں مردانگی، آزادی اور فراخ دلی دوسری چیزوں کے مقابلے زیادہ عزیز تھی۔ اس نے اپنی بیشتر چیزوں کو ضرورت مند لوگوں کے درمیان تقسیم کر دیا تھا۔ وہ شراب پیتا تھا اور اپنے دوستوں کے ایک گروہ کے ساتھ محفلوں میں اپنا وقت گذارتا تھا۔ اس طرح اس کی ساری خرابیاں اور اچھائیاں محدود تھیں لیکن ایک چیز جو کھل کر سامنے آتی تھی وہ یہ تھی کہ اس نے موضوعات عشق و عاشقی کو ابھی تک اپنی زندگی میں داخل نہیں ہونے دیا تھا۔ کئی بار اس کے دوستوں نے رقص کی محفلیں منعقد کی تھیں لیکن وہ ہمیشہ کنارہ کش رہا لیکن جس دن سے وہ حاجی صمد کا وکیل اور کارگزار مقرر ہوا اور اس کی بیٹی مرجان کو دیکھا، اس کی زندگی میں بہت بڑی تبدیلی آگئی۔ ایک جانب وہ خود کو حاجی مرحوم کی وصیت کا پابند مانتا تھا اور اس کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا لیکن دوسری جانب مرجان پر دل و جان سے فریفتہ تھا اور یہ چیز اس کے لیے ساری چیزوں سے بڑھ کر تھی۔ یہ بوجھ ایسا تھا جیسے کسی نے اپنے سامان کو خود سے توپ سے باندھ کر آگ لگا دی ہو۔ ہر صبح اس کو یہ فکر ہوتی تھی کہ حاجی صاحب کی املاک میں اضافہ کرے۔ عورت اور بچے ایک چھوٹے مکان میں رہتے تھے جس کا کرایہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ بچوں کی تعلیم کے لیے معلم کو تنخواہ دینی ہوتی تھی۔ اس طرح وہ صبح سے شام تک حاجی صمد کے خاندان کی خانہ داری میں مشغول رہتا تھا۔

آہستہ آہستہ داش آکل نے تمام لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اس نے اپنے دوسرے دوستوں سے کوئی تعلق نہ رکھا۔ اگرچہ اس نے تمام لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کر رکھی تھی لیکن کبھی لوگ اس کے قریب آنا چاہتے تھے۔ حاجی صاحب کا مال جن کے ہاتھوں سے جاتا رہا تھا وہ سب داش آکل کے بارے میں برا بھلا بکتے تھے اور چائے خانے میں اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ جب کبھی داش آکل چائے خانے میں جاتا تھا تو اس پر لوگ طعنے بھی کستے رہتے تھے۔

''تم اپنے کو داش آکل کہتے ہو، دوسروں کا منہ چاٹتے ہو، خوشامد کرتے ہو۔ خوب حمایتی بنتے ہو، حاجی صاحب کے گھر میں موج کرتے ہو، گویا کسی چیز کو حاصل کرتے ہو اور دوسرے لمحے جب محلے میں پہنچتے ہو تو اس کے احسان کو فراموش کر دیتے ہو۔'' کاکا رستم جو اپنے دل میں داش آکل کے خلاف نفرت رکھتا تھا اپنی لکنت والی زبان سے یوں کہتا:

''بڑھاپے میں جوانی کا شوق! حاجی صمد کی بیٹی کے یار اور عاشق

ہوگئے۔ اپنے عیبوں کو چھپاتے ہو۔ لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہو ایسا جھوٹ بولا کہ حاجی صاحب کے وکیل ہوگئے اور اس کے سارے مال کو ہڑپ لیا۔ خدا سمجھ عطا کرے۔''

دوسری جانب داش آکل کے سامنے کوئی بھی شیخی نہیں بگھارتا اور نہ ہی اس کے سامنے کوئی کچھ کرتا۔ وہ جہاں کہیں جاتا لوگ چھپ کر سرگوشی کرتے اور اس پر انگلی اٹھاتے۔ داش آکل چھپ کر ان کی باتوں کو سنا کرتا تھا لیکن خود کو ظاہر نہیں کرتا اور ان کی باتوں کو اہمیت نہیں دیتا چونکہ مرجان کا عشق خون کی طرح اس کی رگوں میں دوڑ رہا تھا اور وہ ہر وقت اس کے خیالوں میں ڈوبا رہتا تھا۔

داش آکل انتہائی پریشانی کے عالم میں رات میں شراب نوشی کرتا تھا۔ اس نے اپنا دل بہلانے کے لیے ایک طوطا خریدا۔ وہ پنجرہ کے سامنے بیٹھ کر طوطے سے اپنے دل کا درد بیان کرتا تھا اور مرجان کی خواستگاری کرتا تھا۔ اگر چہ مرجان کی ماں نے مرجان کا ہاتھ اس کے سپرد کر دیا تھا اور وہی اس کا سرپرست تھا لیکن وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی وجہ سے اس پردہ نشین عورت اور بچوں کو تکلیف ہو۔ وہ ان کی آزادی کو پسند کرتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ سوچتا تھا جو لڑکی اس کے حوالے کی گئی ہے اگر وہ اس کے ساتھ شادی کرتا ہے تو یہ نمک حرامی ہوگی۔ سب سے خراب بات یہ تھی کہ وہ ہر رات اپنی صورت آئینے میں دیکھتا تھا اور اپنے چہرے کے زخم اور آنکھوں کے نیچے کے نشان پر غور کرتا تھا۔ وہ زور زور سے آہیں بھرتا اور کہتا:

''شاید وہ مجھے دوست نہ مانے بلکہ خوبصورت اور جوان شوہر تلاش لے، نہیں یہ مردانگی سے دور ہے۔ وہ صرف چودہ سال کی ہے اور میں چالیس سال کا ہوں۔ لیکن میں کیا کروں؟ مجھے عشق ہوگیا ہے۔ مرجان! تو نے مجھے مار ڈالا۔'' اس طرح وہ بار بار کہتا ''مرجان تیرے عشق نے مجھے مار ڈالا۔''

وہ مرجان کے بارے میں سوچنے لگتا اور اسے یاد کر کے خوب روتا اور پھر شراب پینے لگتا۔ جب اس کے سر میں درد ہوتا تو ایک کونے میں بیٹھ جاتا اور پھر اسے نیند اپنی آغوش میں لے لیتی۔

لیکن آدھی رات کو جس وقت شیراز کا سارا شہر، گلیاں اور باغ سنسان ہوئے اور تمام ستارے آسمان میں چمک رہے ہوتے، مرجان اپنے طرح طرح کے پھولوں کے ساتھ سو رہی ہوتی اور اس وقت داش آکل اپنی طبیعی حالت میں پورے ہوش وحواس کے ساتھ سماج کے آداب ورسومات کا خیال کیے بغیر اپنی تسکین کی خاطر باہر آتا اور آزادی سے مرجان کو اپنی آغوش میں دبا لیتا۔ اس کے آہستہ رفتار قلب کی تپش، اس کے گرم ہونٹ اور اس کے ملائم جسم کو چھوتا اور اس کے چہرے کو چومتا لیکن جب وہ اپنے خواب سے بیدار ہوتا تو خود کو گالی دیتا، اپنی زندگی سے نفرت کرتا، دیوانوں کی طرح کمرے میں اچھلتا کودتا اور بڑبڑاتا رہتا۔ اس طرح وہ تمام دن عشق میں ڈوبا رہتا اور حاجی صاحب کے حساب وکتاب میں مشغول رہتا۔

اس طرح سات سال گذر گئے۔ داش آکل نے حاجی صاحب کی عورت اور بچوں کی رکھوالی جی جان سے کی اور اس میں ذرا بھی کوتاہی نہ کی۔ اگر حاجی صاحب کا کوئی بچہ ناخوش ہوتا تو وہ ایک ماں کی طرح اس کی ہمت افزائی کرتا اور اس کے دل کو لبھاتا لیکن مرجان سے اس کا رشتہ دوسرا تھا اور وہ شاید مرجان کا ہی عشق تھا کہ وہ ان لوگوں کے آرام وراحت کا پورا خیال رکھتا۔ اس مدت کے درمیان حاجی صاحب کے بچوں کو کسی چیز کی کمی نہیں ہوئی تھی۔

لیکن جو نہیں ہونا چاہیے وہی ہوا۔ مرجان کے لیے شوہر تلاش کیا گیا جو کہ داش آکل سے بھی زیادہ عمر دراز اور بدصورت تھا۔ اس پر داش آکل نے اُف بھی نہ کیا بلکہ اس کے برعکس وہ بہت جوش وخروش سے شادی کے معاملات انجام دینے میں مشغول رہا۔ نکاح کی رات کے لیے اس نے ایک بہت بڑے جشن کا اہتمام کیا۔ حاجی صمد کی بیوی اور بچوں کو ایک مکان میں لے آیا، ایک بڑے کمرے کو لوگوں کی مہمان نوازی کے لیے مخصوص کیا اور شیراز شہر کے سبھی بزرگ، تاجر، سوداگر اور دیگر لوگوں کو اس جشن میں شرکت کے لیے دعوت دی۔

شادی کے دن ظہر کے بعد پانچ بجے سے جس وقت تمام مہمان کمرے میں قیمتی قالین پر بیٹھے تھے اور شیرینی ومیوہ کھا رہے تھے اس وقت داش آکل اپنی پرانی حالت میں نگاہ نیچی کیے، شال اوڑھے، کالے ساٹن کا پائجامہ پہنے اور سر پر ایک نئی بغیر کا مدار ٹوپی پہنے حاضر ہوا اور اس کے پیچھے تین آدمی رجسٹر اور کاپی لیے ہوئے چل رہے تھے۔ وہاں موجود سبھی مہمانوں نے اسے سر سے پاؤں تک گھورا۔ داش آکل تیز قدموں سے چلتا ہوا امام صاحب کے سامنے آیا اور بولا:

''آقا امام، حاجی صاحب نے جو وصیت کی تھی اور آج سے سات سال قبل آپ نے جو ذمہ داری مجھے سونپی تھی وہ میں نے بخوبی انجام دی۔ جو بچے اس وقت پانچ سال کے تھے وہ آج بارہ سال کے ہو چکے ہیں۔ یہ سارے رجسٹر کاپی حاجی صاحب کے حساب وکتاب کے ہیں (اس نے تینوں آدمی کی جانب اشارہ کیا جو اس کے پیچھے کھڑے تھے) آج کے دن تک جو کچھ بھی خرچ ہوا اور جو آج رات خرچ ہو رہا ہے یہ سارے خرچ میں نے اپنی جیب سے دیے ہیں۔''

اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ اس کا گلا بھر آیا اور اس سے پہلے کہ وہ کوئی دوسری بات کہتا یا جواب سنتا اس نے اپنا سر جھکا لیا اور آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے باہر چلا گیا۔ اس نے گلی میں پہنچ کر راحت کی سانس لی اور محسوس کیا کہ وہ آزاد ہوگیا اور اس کے سر سے بوجھ اتر گیا لیکن اس کا دل ٹوٹا ہوا اور زخمی تھا۔ وہ تیز

تیز قدموں سے بغیر رکے ہوئے چلتا رہا اور اس طرح وہ ملا اسحٰق کے گھر پہنچا جو ایک شرابی کے نام سے مشہور تھا۔ وہ اس کے پرانے مکان میں داخل ہوا جس کے چھوٹے چھوٹے کمرے گندے ہو چکے تھے، اس کی کھڑکیوں میں مکھیوں کے چھتوں کی طرح سوراخیں ہو چکی تھیں اور حوض کے پانی کا رنگ سبز ہو چکا تھا جس سے بدبو آ رہی تھی۔ کمزور ملا اسحٰق میلی ٹوپی اوڑھے، پکی داڑھی رکھے لالچی نگاہوں کے ساتھ نمودار ہوا اور ہنسنے لگا۔

داش آکل نے پردرد لہجے میں کہا:

"مہربانی کر کے کوئی اچھی شراب لاؤ تا کہ میں اپنا گلا تر کر سکوں۔"

ملا اسحٰق نے اپنا سر ہلایا۔ وہ سیڑھی سے نیچے گیا اور چند لمحوں بعد شراب کی ایک بوتل لے کر آیا۔ داش آکل نے اس کے ہاتھ سے بوتل لے لی اور اس کے اوپری سرے کو دیوار پر دے مارا جس سے اس بوتل کا آدھا حصہ ٹوٹ گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے بوتل کو ایک ہاتھ سے پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے اپنے چہرے کو صاف کیا۔ ملا اسحٰق کا ایک چھوٹا بچہ جو نہایت گندا تھا، جس کا پیٹ نکلا ہوا، منہ کھلا ہوا اور ہونٹ چہرے پر لٹکا ہوا تھا وہ داش آکل کی حرکت کو دیکھ رہا تھا۔ داش آکل نے اپنی انگلی طاقچے پر نمک دان میں ڈالی اور اسے چاٹ لیا۔

ملا اسحٰق باہر آیا اور داش آکل کی جانب مخاطب ہو کر بولا!

"اس طرح پینے میں کیا مزہ؟"

پھر اس کے کپڑے پر اپنا ہاتھ رکھا اور کہا:

"یہ تم نے کیا چھپا رکھا ہے۔ اسے لوگوں کی نگاہ سے کیسے بچا رکھا ہے۔"

داش آکل غم زدہ انداز میں مسکرایا، اس نے اپنی جیب سے ایک سکہ نکالا، اس کو اپنی ہتھیلی پر رکھا اور وہاں سے باہر آیا۔ وہ شراب سے بالکل مدہوش تھا۔ اس کا جسم گرم اور دل پریشان تھا اور اس کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ گلیوں میں اب بھی بارش کے اثر سے دوپہر کے بعد سے نمی بھری ہوئی تھی اور پھولوں کی پھیکی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ مرجان کی صورت، سرخ گال، کالی آنکھیں، اونچی بھنویں اور چہرے پر بکھرے ہوئے بال داش آکل کی نگاہوں میں مجسم تھے۔ وہ اپنی گزری زندگی کی ساری باتوں کو یاد کرتا اور پھر یہ ساری یادیں مرجان کی صورت کے سامنے ایک ایک کر کے غائب ہو جاتیں۔ اپنے دوستوں کے ساتھ سعدی شیرازی اور بابا افضل کوہی کے مزار پر زیارت کرنے والی بات بھی اسے یاد آئی۔ کبھی وہ مسکراتا اور کبھی بھنوؤں کو چڑھا کر اس زمانے کو یاد کرتا۔ اس کا دل غم زدہ تھا اور وہ چاہتا تھا کہ بہت دور چلا جائے۔ وہ سوچنے لگا کہ آج رات پھر شراب پیوں اور طوطے سے اپنے دل کا حال بیان کروں۔ اس کی زندگی پوری طرح، خالی اور بے معنی ہو چکی تھی۔ اس ضمن میں اسے ایک شعر یاد آیا۔

بہ شب نشینی زندانیان برم حسرت
کہ نقل مجلسشان دانہ ہای زنجیر است

(مفہوم: قید میں پڑے ہوئے لوگوں کی راتیں میرے لیے حسرت لے کر آئیں کہ ان کی مجلسوں کا شغل ہونا زنجیر کے دانے ہیں۔)

اسی وقت اسے دوسرا شعر یاد آیا اور اس نے اسے زور سے پڑھا:

دلم دیوانہ شد، ای عاقلان، آرید زنجیری
کہ نبود چارۂ دیوانہ جز زنجیر تدبیری!

(مفہوم: اے عقلمند میرا دل دیوانہ ہو گیا ہے ایک زنجیر لے آؤ کہ دیوانے کا علاج سوائے زنجیر کے کچھ بھی نہیں ہے۔)

اس شعر کو اس نے ناامیدی اور غم و غصے کی حالت میں پڑھا جس سے اس کا حوصلہ پست ہو گیا اور اس کی فکر خاموش ہو گئی۔

جس وقت ہوا رک گئی، داش آکل محلہ سردزک پہنچا۔ اس جگہ جہاں کبھی میدان تھا اور وہ اپنے میں وہاں اکثر و بیشتر آ کر بیٹھتا تھا اور کسی کو بھی جرأت نہ تھی کہ اس کے سامنے آئے۔ اس وقت وہ بغیر کسی ارادے کے اپنے گھر کے سامنے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ ایک لمبی پائپ والا سگار نکالا اور اسے آہستہ آہستہ پینے لگا۔ اسے احساس ہوا کہ اب یہ جگہ اور یہاں کے لوگ اس کے لیے بے کار ہو چکے تھے جب کہ وہ خود شکست خوردہ ہو چکا تھا، اس کی آنکھیں سیاہ ہو چکی تھیں۔ اس کے سر میں شدید درد تھا۔ اچانک اس کے سامنے ایک سایہ نمودار ہوا جو اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔ جب وہ سایہ نزدیک آیا تو بولا:

"کیا مجھے تم پہچانتے ہو؟"

داش آکل نے پہچانا کہ وہ کاکا رستم ہے، داش آکل کھڑا ہوا، اپنا ہاتھ اس کی کمر پر مارا اور اسے زمین پر پٹخ دیا اور کہا:

"یہ تیری بے غیرتی کا صلہ ہے، تو نے غلط گمان کیا اور جلے پر نمک چھڑک دیا۔"

کاکا رستم تمسخر آمیز ہنسی کے ساتھ سامنے آیا اور ہکلاتے ہوئے بولا:

"اتنا اچھا وقت دوبارہ نہیں آتا۔ آج کی رات حاجی صاحب کے گھر شادی ہے لیکن تو وہاں نہیں ہے۔"

داش آکل نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا:

"خدا نے تجھے جان بوجھ کر آدھی زبان دی اور اس آدھی زبان کو بھی میں آج رات کھینچ لوں گا۔"

اس نے اپنا ہاتھ باہر کھینچا۔ کاکا رستم نے بھی رستم پہلوان کی طرح خنجر اپنے ہاتھ میں لیا۔ داش آکل نے اپنا خنجر زمین میں گاڑ دیا اور اپنا ہاتھ چھاتی پر رکھ کر بولا:

"میں چاہتا ہوں کہ جو بہادر ہے وہ اس خنجر کو زمین سے باہر نکالے۔"

کاکارستم نے اچانک اس پر حملہ کردیا لیکن داش آکل نے اس کے ہاتھ پر ایسا وار کیا کہ اس کا خنجر ہاتھ سے گر گیا۔ ان دونوں کے لڑنے کی آواز سن کر اس جگہ سے گزرنے والے تمام لوگ تماشا دیکھنے کے لیے کھڑے ہو گئے لیکن کسی میں اتنی جرأت نہ تھی کہ ان کے سامنے آئے۔

داش آکل نے مسکراتے ہوئے کہا:

''جاؤ، جاؤ، لیکن شرط یہ ہے کہ اس بار اچھی طرح نگاہ رکھنا، چونکہ آج رات میں چاہتا ہوں کہ اپنا پچھلا حساب بیباق کرلوں۔''

کاکارستم مٹھی باندھے سامنے آیا اور دونوں ایک دوسرے سے ہاتھا پائی کرنے لگے۔ آدھے گھنٹے تک یہ دونوں کی لڑائی جاری رہی۔ دونوں کے سر اور داڑھی سے پسینہ بہنے لگا لیکن کسی کی جیت نہیں ہوئی۔ اس کشمکش کے درمیان داش آکل کا سر پتھر کی سطح سے ٹکرایا اور بہت قریب تھا کہ اس کی حالت غیر ہوجائے، کاکارستم جو داش آکل کو جان سے مارنے کا قصد کیے ہوئے تھا اس کی نگاہ داش آکل کے خنجر پر پڑی جو اس کے ہاتھ کے نزدیک ہی پڑا تھا۔ اس نے پوری قوت وتوانائی کے ساتھ اس خنجر کو زمین سے باہر کھینچا اور داش آکل کے پہلو میں گھونپ دیا۔ تماشا دیکھنے والے لوگ دوڑ کر سامنے آئے اور داش آکل کو مشکل سے اٹھایا۔ اس کے پہلو سے خون بہہ رہا تھا اور اس کا ہاتھ زخمی تھا۔ اس نے چند لمحے بعد ایک دیوار کے سہارے ٹیک لگائی لیکن دوبارہ زمین پر گر پڑا۔ اس کے بعد لوگ اسے اٹھا کر اس کے گھر لے آئے۔

دوسری صبح داش آکل کے زخمی ہونے کی خبر حاجی صمد صاحب کے گھر پہنچی۔ اس گھر کا سب سے بڑا لڑکا داش آکل کے احوال دریافت کرنے اس کے گھر گیا۔ جب وہ داش آکل کے سرہانے پہنچا تو دیکھا کہ اس کا رنگ اڑا ہوا ہے، وہ بستر پر پڑا ہے، اس کے منھ سے خون جاری ہے، اس کی آنکھیں تنی ہوئی ہیں اور اسے سانس لینے میں دقت ہورہی ہے۔ داش آکل نے بے ہوشی کی حالت میں بھی اسے پہچان لیا اور نحیف آواز میں لڑکھڑاتے ہوئے بولا:

''اس دنیا میں صرف یہی ایک طوطا میرے پاس ہے، جو میرا غم گسار ہے، اس طوطے کو تمھارے حوالے کیا۔''

وہ دوبارہ خاموش ہوگیا۔ اس لڑکے نے اپنے ریشمی رومال سے داش آکل کے آنسو پونچھے۔ داش آکل پھر بے ہوش ہوگیا اور ایک لمحے بعد مرگیا۔

شیراز کے تمام لوگ اس کے لیے رو پڑے۔

وہ حاجی صمد کا لڑکا طوطے کو پنجرے کے ساتھ اپنے گھر لے گیا۔

اس دن سہ پہر کا وقت تھا۔ مرجان طوطے کے پنجرے کے سامنے سے گذری اور اس نے اس طوطے کے پر، بال، چونچ اور آنکھوں کو درست کیا۔ اچانک طوطے نے اپنا منھ کھولا اور بے ساختہ بولنے لگا:

''مرجان، مرجان تونے مجھے مار ڈالا۔ میں ٹھیک کہتا ہوں۔ مرجان، تیرے عشق نے مجھے مار ڈالا۔''

مرجان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔

❑❑❑

مترجم کا پتہ:
Centre for Persian and Central Asian Studies
School of Language, Literature & Culture Studies
JNU, New Delhi-110067

تعلیمی تشکیل نو کے مسائل

مصنف: خواجہ غلام السیدین

اسکول میں ایک ایسا ماحول بنانا جس میں بچوں کی فطری صلاحیتیں آزاد فضا میں نشوونما پاکر ابھر سکیں، ان کی فطری نشوونما کے لیے بے حد ضروری ہے۔ اس کے لیے لازمی ہے کہ اساتذہ کی تربیت ایک خاص نہج پر کی جائے۔ اس کتاب میں انھی امور پر گفتگو کی گئی ہے۔

صفحات: 307، قیمت -/96 روپے

خواجہ میر درد

مصنف: ظہیر احمد صدیقی

خواجہ میر درد اردو کے سب سے بڑے صوفی شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ حالانکہ ان کے کلام میں تصوف کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ اس کتاب میں درد کے حالات زندگی، ان کی تصانیف، شاعرانہ خصوصیات کے ساتھ ساتھ تصوف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نوآموز طلبہ کے لیے ایک بہترین کتاب۔

صفحات: 64، قیمت: 14 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45% اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر.کے. پورم، نئی دہلی۔ 066 110

خواجہ الطاف حسین حالی　　　ہماری مطبوعات　　　"حیات جاوید" سے ماخوذ

سرسید کا بچپن

سرسید کے پیدا ہونے سے پہلے ان کی بہن صفیۃ النسا بیگم اور ان کے بھائی سید محمد خاں پیدا ہو چکے تھے۔ سید محمد خاں کی ولادت کے بعد چھ برس تک ان کے والدین کے ہاں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا تھا اس لیے سید احمد خاں کے پیدا ہونے کی ان کو نہایت خوشی ہوئی۔ سرسید سے چند مہینے پہلے ان کے ماموں نواب زین العابدین خاں کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا تھا جس کا نام حاتم علی خاں تھا۔ سرسید کو اول حاتم علی خاں کی والدہ نے دودھ پلایا اور پھر خود سرسید کی والدہ نے۔ وہ اپنے خاندان کے اکثر بچوں کی بہ نسبت زیادہ قوی اور توانا اور ہاتھ پانو سے تندرست پیدا ہوئے تھے۔ وہ اپنی ماں کی زبانی بیان کرتے تھے کہ جب ان کے نانا دوسری بار کلکتہ سے دلی میں آئے اور ان کو پہلے ہی بار دیکھا تو یہ کہا کہ "یہ تو ہمارے گھر میں جاٹ پیدا ہوا ہے۔"

سرسید کے بیان سے مفہوم ہوتا تھا کہ ان کے بچپن میں جسمانی صحت اور فزیکل قابلیت کے سوا کوئی ایسی خصوصیت جس سے ان کے بچپن کو معمولی لڑکوں کے بچپن پر بے تکلف فوقیت دی جا سکے، نہیں پائی جاتی تھی یعنی جیسے کہ بعضے بچے ابتدا میں نہایت ذکی اور طبّاع اور اپنے ہمجولیوں میں سب سے زیادہ تیز اور ہوشیار ہوتے ہیں، سرسید میں کوئی اس قسم کا صریح امتیاز نہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے قوائے ذہنیہ کو محض دماغی ریاضت اور لگاتار غور و فکر سے بتدریج ترقی دی تھی اور اسی لیے ان کی لائف کا آغاز معمولی آدمیوں کی زندگی سے کچھ زیادہ چمکدار معلوم نہیں ہوتا لیکن جس قدر آگے بڑھتے جایئے اسی قدر اس میں زیادہ عظمت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ہیرو کو معمولی آدمیوں کی سطح سے بالاتر کر دیتی ہے۔ اسی لیے بعض حکما کی یہ رائے ہے کہ محنت سے آدمی جو چاہے سو ہو سکتا ہے۔

الغرض جب سرسید پیدا ہوئے تو ان کے والد نے شاہ غلام علی صاحب سے نام رکھنے کی درخواست کی۔ شاہ صاحب ہی نے بڑے بھائی کا نام محمد رکھا تھا ان کا نام احمد رکھا۔ سرسید کے دادا ان کے والد کی شادی ہونے سے پہلے قضا کر چکے تھے اور یہ اور ان کے بہن بھائی شاہ صاحب ہی کو دادا حضرت کہا کرتے تھے۔ سرسید کہتے تھے کہ "شاہ صاحب کو بھی ہم سب سے ایسی ہی محبت تھی جیسی حقیقی دادا کو اپنے پوتوں سے ہوتی ہے۔ شاہ صاحب نے تاہل اختیار نہیں کیا تھا اور وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ گو خدا تعالیٰ نے مجھے اولاد کے جھگڑوں سے آزاد رکھا ہے لیکن متقی کی اولاد کی محبت ایسی دے دی ہے کہ اس کے بچوں کی تکلیف یا بیماری مجھ کو بےچین کر دیتی ہے۔

سرسید کو مسماۃ مان بی بی نے جو ایک قدیم خیر خواہ خادمہ ان کے گھرانے کی تھی پالا تھا۔ اس لیے ان کو مان بی بی سے نہایت محبت تھی۔ وہ پانچ برس کے تھے جب مان بی بی کا انتقال ہوا۔ ان کا بیان ہے کہ "مجھے خوب یاد ہے مان بی بی مرنے سے چند گھنٹے پہلے فالسہ کا شربت مجھ کو پلا رہی تھی۔ جب وہ مر گئی تو مجھے اس کے مرنے کا نہایت رنج ہوا۔ میری والدہ نے مجھے سمجھایا کہ وہ خدا کے پاس گئی ہے۔ بہت اچھے مکان میں رہتی ہے، بہت سے نوکر چاکر اس کی خدمت کرتے ہیں اور اس کی بہت آرام سے گذرتی ہے، تم کچھ رنج مت کرو۔ مجھ کو ان کے کہنے سے پورا یقین تھا کہ فی الواقع ایسا ہی ہے۔ مدت تک ہر جمعرات کو اس کی فاتحہ ہوا کرتی تھی اور کسی محتاج کو کھانا دیا جاتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ سب کھانا مان بی بی کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ اس نے مرتے وقت کہا تھا کہ میرا تمام زیور سید کا ہے۔ مگر میری والدہ اس کو خیرات میں دینا چاہتی تھیں۔ ایک دن انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ اگر تم کہو تو یہ گہنا مان بی بی کے پاس بھیج دوں۔ میں نے کہا ہاں بھیج دو۔ والدہ نے وہ سب گہنا مختلف طرح سے خیرات میں دے دیا۔"

بچپن میں سرسید پر نہ تو ایسی قید تھی کہ کھیلنے کودنے کی بالکل بندی ہو اور نہ ایسی آزادی تھی کہ جہاں چاہیں اور جن کے ساتھ چاہیں کھیلتے کودتے

مولانا الطاف حسین حالی نہ صرف ایک رجحان ساز شاعر اور نقاد تھے بلکہ انھوں نے سوانح نگاری میں بھی اپنا لوہا منوایا اور "حیات سعدی" "یادگار غالب" اور "حیات جاوید" جیسی کتابیں یادگار چھوڑیں۔ حیات جاوید میں حالی نے سرسید کی زندگی کے حالات، افکار اور خیالات پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ اس کتاب کی اہمیت یوں بھی ہے کہ حالی سرسید سے بے حد قریب تھے اور سرسید نے ملک و قوم کی جو خدمت کی اس کے عینی شاہد۔ قومی اردو کونسل نے اس کا پانچواں ایڈیشن شائع کیا ہے۔ 907 صفحات کی اس کتاب کی قیمت 181 روپئے ہے۔ قومی اردو کونسل اپنی مطبوعات پر طلبہ کو 45فیصد اور اساتذہ کو 40 فیصد خصوصی رعایت بھی دیتی ہے۔

پھریں۔ ان کی بڑی خوش نصیبی یہ تھی کہ خود ان کے ماموں ان کی خالہ اور دیگر نزدیکی رشتہ داروں کے چودہ پندرہ لڑکے ان کے ہم عمر تھے جو آپس میں کھیلنے کودنے کے لیے کافی تھے۔ اس لیے ان کو نوکروں اور اجلافوں کے بچوں اور اشرافوں کے آوارہ لڑکوں سے ملنے جلنے اور ان کے ساتھ کھیلنے کا کبھی موقع نہیں ملا۔ ان کے بزرگوں نے یہ اجازت دے رکھی تھی کہ جس کھیل کو تمھارا جی چاہے شوق سے کھیلو مگر کسی کھیل کو چھپا کر مت کھیلو۔ اس لیے سب لڑکے جو کھیل کھیلتے تھے اپنے بڑوں کے سامنے کھیلتے تھے۔ ان کے کھیلوں میں کوئی بات ایسی نہ ہوتی تھی جو اپنے بزرگوں کے سامنے نہ کر سکیں۔ خواجہ فرید کی حویلی جس میں وہ اور ان کے ہم عمر لڑکے رہتے تھے اس کا چوک اور اس کی چھتیں ہر قسم کی بھاگ دوڑ کے کھیلوں کے لیے کافی تھیں۔ ابتدا میں وہ اکثر گیند بلا، کبڈی، گیڑیاں، آنکھ مچولی، چیل چلو وغیرہ کھیلتے تھے۔ اگرچہ گیڑیاں کھیلنے کو اشراف معیوب جانتے تھے مگر ان کے بزرگوں نے اجازت دے رکھی تھی کہ آپس میں سب بھائی مل کر گیڑیاں بھی کھیلو تو کچھ مضائقہ نہیں۔

سرسید کہتے تھے کہ ”کھیل میں جب کچھ جھگڑا ہو جاتا تو بڑوں میں سے کوئی آ کر تصفیہ کر دیتا اور جس کی طرف سے چنید معلوم ہوئی اس کو برا بھلا کہتا اور شرمندہ کرتا کہ چنید کرنا بے ایمانی کی بات ہے، کبھی چنید مت کرو اور جو چنید کرے اس کو ہرگز اپنے ساتھ مت کھیلنے دو۔“

ان کا بیان تھا کہ ”باوجود اس قدر آزادی کے بچپن میں مجھے تنہا باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔ جب میری والدہ نے اپنے رہنے کی جدا حویلی بنائی اور وہاں آ رہیں تو باوجود یہ کہ اس حویلی میں اور نانا صاحب کی حویلی میں صرف ایک سڑک درمیان تھی جب کبھی میں ان کی حویلی میں جاتا تو ایک آدمی میرے ساتھ جاتا۔ اسی لیے بچپن میں مجھے گھر سے باہر جانے اور عام صحبتوں میں بیٹھنے یا آوارہ پھرنے کا بالکل اتفاق نہیں ہوا۔“

سرسید اپنے کھیل کود کے زمانے میں بہت مستعد اور چالاک اور کسی قدر شوخ بھی تھے۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اکثر شوخی کیا کرتے۔ وہ کہتے تھے کہ ”ایک بار میں نے اپنے ایک رشتہ دار بھائی کو جو استنجا کر رہا تھا چپکے چپکے اس کے پیچھے جا کر چت کر دیا۔ اس کے سارے کپڑے خراب ہو گئے۔ وہ پتھر لے کر مجھے مارنے کو دوڑا اور کئی پتھر پھینکے مگر میں بچ بچ گیا۔ آخر سب بھائیوں نے بیچ بچاؤ کر کے صلح کرا دی۔ اسی طرح ایک بار میں شطرنج کھیلتے میں ایک اپنے رشتہ دار بھائی سے لڑ پڑا۔ میرے مکے سے اس کے ہاتھ کی انگلی اتر گئی اور کئی دن بعد اچھی ہوئی۔ ہمیشہ یوں ہی لڑائی بھڑائی مار کٹائی ہوتی تھی مگر آخر کو سب ایک ہو جاتے تھے۔“

سرسید لکھتے ہیں کہ ”میرے نانا صبح کا کھانا اندر زنانے میں کھاتے تھے۔ ایک چوڑا چکلا دسترخوان بچھتا تھا۔ بیٹے بیٹیاں، پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں اور بیٹیوں کی بیویاں سب ان کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ بچوں کے آگے خالی رکابیاں ہوتی تھیں۔ نانا صاحب ہر ایک سے پوچھتے تھے کہ کون سی چیز کھاؤ گے؟ جو کچھ وہ بتاتا وہی چیز چمچے میں لے کر اپنے ہاتھ سے اس کی رکابی میں ڈال دیتے۔ تمام بچے بہت ادب اور صفائی سے ان کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ سب کو خیال رہتا تھا کہ کوئی چیز گرنے نہ پائے ہاتھ کھانے میں زیادہ نہ بھرے اور نوالا چبانے کی آواز منہ سے نہ نکلے۔ رات کا کھانا وہ باہر دیوان خانے میں کھاتے تھے۔ زنانہ ہو جاتا تھا۔ میری والدہ اور میری چھوٹی خالا کھانا کھلانے آتی تھیں۔ ہم سب لڑکے ان کے سامنے بیٹھتے تھے۔ ہم کو بڑی مشکل پڑتی تھی کسی کے پانو کا دھبا سفید چاندنی پر لگ جاتا تھا تو نہایت ناراض ہوتے تھے۔ روشنائی وغیرہ کا دھبا کسی کے کپڑے پر ہوتا تھا اس سے بھی ناخوش ہوتے تھے۔ شام کو چراغ جلنے کے بعد ان کے پوتے اور نواسے جو مکتب میں پڑھتے تھے اور جن میں سے ایک میں بھی تھا، ان کو سبق سنانے جاتے تھے۔ جس کا سبق اچھا یاد ہوتا اس کو کسی قسم کی عمدہ مٹھائی ملتی اور جس کو یاد نہ ہوتا اس کو کچھ نہ دیتے اور گھر کر دیتے۔

گرمی اور برسات کے موسم میں اب بھی دلی کے اکثر باشندے سہ پہر کو جمنا پر جا کر پانی کی سیر دیکھتے ہیں اور تیرنے والے تیرتے ہیں۔ مگر پچاس برس پہلے وہاں اشراف تیرنے والوں کے بہت دلچسپ جلسے ہوتے تھے۔ سرسید کہتے تھے کہ ”میں نے اور بڑے بھائی نے اپنے والد سے تیرنا سیکھا تھا۔ ایک زمانہ تو وہ تھا کہ ایک طرف دلی کے مشہور تیراک مولوی علیم اللہ کا غول ہوتا تھا جن میں مرزا مغل اور مرزا طفل بہت سربرآوردہ اور نامی تھے اور دوسری طرف ہمارے والد کے ساتھ سوا سو شاگردوں کا گروہ ہوتا تھا۔ یہ سب ایک ساتھ دریا میں کودتے تھے اور مجنوں کے ٹیلے سے شیخ محمد کی بائیں تک یہ سارا گروہ تیرتا جاتا تھا۔ پھر جب ہم دونوں بھائی تیرنا سیکھتے تھے اس زمانے میں بھی تیس چالیس آدمی والد کے ساتھ ہوتے تھے انھیں دنوں میں نواب اکبر خاں اور چند اور رئیس زادے بھی تیرنا سیکھتے تھے۔ زینۃ المساجد کے پاس نواب احمد بخش خاں کے باغ کے نیچے جمنا بہتی تھی۔ وہاں سے تیرنا شروع ہوتا تھا۔ مغرب کے وقت سب تیراک زینۃ المساجد میں جمع ہو جاتے تھے اور مغرب کی نماز جماعت سے پڑھ کر اپنے اپنے گھر چلے آتے تھے۔ میں ان جلسوں میں اکثر شریک ہوتا تھا۔

تیراندازی کی صحبتیں بھی سرسید کے ماموں نواب زین العابدین خاں کے مکان پر ہوتی تھیں وہ کہتے تھے کہ ”مجھے اپنے ماموں اور والد کے شوق کا وہ زمانہ جب کہ نہایت دھوم دھام سے تیراندازی ہوتی تھی، یاد نہیں۔ مگر جب دوبارہ تیراندازی کا چرچا ہوا وہ بخوبی یاد ہے۔ اس زمانے میں دریا کا جانا موقوف ہو گیا تھا۔ ظہر کی نماز کے بعد تیراندازی شروع ہوتی تھی۔ نواب فتح

اللہ بیگ خاں، نواب سید عظمت اللہ خاں، نواب ابراہیم علی خاں اور چند شاہزادے اور رئیس اور شوقین اس جلسہ میں شریک ہوتے تھے۔ نواب شمس الدین خاں رئیس فیروز پور جھرکہ جب دلی میں ہوتے تھے تو وہ بھی آتے تھے۔ میں نے بھی اسی زمانے میں تیراندازی سیکھی اور مجھ کو خاصی مشق ہوگئی تھی مجھے خوب یاد ہے کہ ایک دفعہ میرا نشانہ جو تودے میں نہایت صفائی اور خوبی سے جا کر بیٹھا تو والد بہت خوش ہوئے اور کہا ”مچھلی کے جائے کو کون تیرنا سکھائے۔“ یہ جلسہ برسوں تک رہا پھر موقوف ہوگیا۔“

اہل اللہ اور مقدس لوگوں کی عظمت کا خیال بچپن سے سرسید کے دل میں بٹھایا گیا تھا۔ وہ اپنے والد کے ساتھ اکثر شاہ غلام علی صاحب کی خدمت میں جاتے تھے اور شاہ صاحب سے ان کی عقیدت کا رنگ اپنی آنکھ سے دیکھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ”مرزا صاحب کے عرس میں شاہ صاحب ایک روپیہ ان کے مزار پر چڑھایا کرتے تھے اور اس روپیہ کے لینے کا حق میرے والد کے سوا اور کسی کو نہ تھا۔ ایک دفعہ عرس کی تاریخ سے کچھ پہلے ایک مرید نے شاہ صاحب سے اجازت لے لی کہ اب کی بار نذر کا روپیہ مجھے عنایت ہو۔ میرے والد کو بھی خبر ہوگئی۔ جب شاہ صاحب نے روپیہ چڑھانے کا ارادہ کیا تو والد نے عرض کی کہ حضرت! میرے اور میری اولاد کے جیتے جی آپ نذر کا روپیہ لینے کی اوروں کو اجازت دیتے ہیں؟ شاہ صاحب نے فرمایا نہیں نہیں تمھارے سوا کوئی نہیں لے سکتا۔ میں اس وقت صغیر سن تھا۔ جب شاہ صاحب نے روپیہ چڑھایا والد نے مجھ سے کہا جاؤ روپیہ اٹھا لو۔ میں نے آگے بڑھ کر روپیہ اٹھا لیا۔“

دلی سے سات کوس مغلپور ایک جاٹوں کا گاؤں ہے۔ وہاں سرسید کے والد کی کچھ ملک بطور معافی کے تھی۔ اگر کبھی فصل کے موقع پر ان کے والد مغلپور جاتے تو ان کو بھی اکثر اپنے ساتھ لے جاتے اور ایک ایک ہفتے گاؤں میں رہتے۔ سرسید کہتے تھے کہ ”اس عمر میں گاؤں میں جا کر رہنا، جنگل میں پھرنا، عمدہ دودھ اور دہی اور تازہ تازہ گھی اور جاٹنیوں کے ہاتھ کی پکی ہوئی بجرے یا مکئی کی روٹیاں کھانا نہایت ہی مزہ دیتا تھا۔“

سرسید کے والد کو اکبر شاہ کے زمانے میں ہر سال تاریخ جلوس کے جشن پر پانچ پارچہ اور تین رقوم جواہر کا خلعت عطا ہوتا تھا مگر اخیر میں جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا انھوں نے دربار کا جانا کم کر دیا تھا اور اپنا خلعت سرسید کو باوجود یہ کہ ان کی عمر کم تھی، دلوانا شروع کر دیا تھا۔

سرسید کہتے تھے کہ ”ایک بار خلعت ملنے کی تاریخ پر ایسا اتفاق ہوا کہ والد بہت سویرے اٹھ کر قلعہ چلے گئے اور میں بہت دن چڑھے اٹھا۔ ہر چند بہت جلد گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں پہنچا مگر پھر بھی دیر ہوگئی۔ جب لال پردہ کے قریب پہنچا تو قاعدہ کے موافق اوّل دربار میں جا کر آداب بجا لانے کا وقت نہیں رہا تھا۔ داروغہ نے کہا کہ بس اب خلعت پہن کر ایک ہی دفعہ دربار میں جانا جب خلعت پہن کر میں نے دربار میں جانا چاہا تو دربار برخاست ہو چکا تھا اور بادشاہ تخت پر سے اٹھ کر ہوادار پر سوار ہو چکے تھے۔ بادشاہ نے مجھے دیکھ کر والد سے جو اس وقت ہوادار کے پاس ہی تھے، پوچھا کہ ”تمھارا بیٹا ہے؟“ انھوں نے کہا ”حضور کا خانہ زاد“ بادشاہ چپکے ہو رہے۔ لوگوں نے جانا کہ بس اب محل میں چلے جائیں گے۔ مگر جب تسبیح خانہ میں پہنچے تو وہاں ٹھہر گئے۔ تسبیح خانہ میں بھی ایک چبوترا بنا ہوا تھا جہاں کبھی کبھی دربار کیا کرتے تھے۔ اس چبوترے پر بیٹھ گئے اور جواہر خانے کے داروغہ کو کشتی جواہر حاضر کرنے کا حکم ہوا۔ میں بھی وہاں پہنچ گیا تھا۔ بادشاہ نے مجھے اپنے سامنے بلایا اور کمال عنایت سے میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ دیر کیوں کی؟ حاضرین نے کہا۔ عرض کرو کہ تقصیر ہوئی۔ مگر میں چپکا کھڑا رہا۔ جب حضور نے دوبارہ پوچھا تو میں نے عرض کیا کہ سو گیا تھا۔ بادشاہ مسکرائے اور فرمایا بہت سویرے اٹھا کرو اور ہاتھ چھوڑ دیے۔ لوگوں نے کہا آداب بجا لاؤ۔ میں آداب بجا لایا۔ بادشاہ نے جواہرات کی معمولی رقمیں اپنے ہاتھ سے پہنائیں۔ میں نے نذر دی اور بادشاہ اٹھ کر خاصی ڈیوڑھی سے محل میں چلے گئے۔ تمام درباری میرے والد کو بادشاہ کی اس عنایت پر مبارک سلامت کہنے لگے۔“ سرسید کہتے تھے کہ ”اس زمانہ میں میری عمر آٹھ نو برس کی ہوگی۔ تقریباً انھی دنوں میں راجہ رام موہن رائے جو برھمو سماج کے بانی تھے، ان کو اکبر شاہ نے کلکتہ سے بلایا تھا تاکہ اضافۂ پنشن بادشاہی کے لیے ان کو لندن بھیجا جائے چنانچہ وہ بادشاہ کی طرف سے لندن بھیجے گئے اور 1831 میں وہاں پہنچے“ سرسید نے لندن جانے سے پہلے ان کو متعدد دفعہ دربار شاہی میں دیکھا تھا۔

سرسید کی تعلیم

سرسید کہتے تھے کہ ”مجھ کو اپنی بسم اللہ کی تقریب بخوبی یاد ہے۔ سہ پہر کا وقت تھا اور آدمی کثرت سے جمع تھے خصوصاً حضرت شاہ غلام علی صاحب بھی تشریف رکھتے تھے۔ مجھ کو لا کر حضرت کے سامنے بٹھا دیا تھا۔ میں اس مجمع کو دیکھ کر ہکا بکا سا ہوگیا۔ میرے سامنے تختی رکھی گئی اور غالباً شاہ صاحب ہی نے فرمایا کہ پڑھو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم مگر میں کچھ نہ بولا اور حضرت صاحب کی طرف دیکھتا رہا انھوں نے اٹھا کر مجھے اپنی گود میں بٹھا لیا اور فرمایا کہ ہمارے پاس بیٹھ کر پڑھیں گے اور بسم اللہ پڑھ کر اقراء کی اول کی آیتیں مالم یعلم تک پڑھیں میں بھی ان کے ساتھ ساتھ پڑھتا گیا۔“ سرسید نے جب یہ ذکر کیا تو بطور فخر کے اپنا یہ فارسی شعر جو خاص اسی موقع کے لیے انھوں نے کہا تھا پڑھا۔

بہ مکتب رفتم و آموختم اسرار یزدانی
زفیض نقشبند وقت و جان جان جانانی

سر سید کہتے تھے کہ "شاہ صاحب اپنی خانقاہ سے کبھی نہیں اٹھتے تھے اور کسی کے ہاں نہیں جاتے تھے الا ماشاء اللہ۔ صرف میرے والد پر جو غایت درجہ کی شفقت تھی اس لیے کبھی کبھی ہمارے گھر قدم رنجہ فرماتے تھے۔"

بسم اللہ ہونے کے بعد سر سید نے قرآن مجید پڑھنا شروع کیا۔ ان کی ننھیال میں قدیم سے کوئی نہ کوئی استانی نوکر رہتی تھی، سر سید نے استانی ہی سے جو ایک اشراف گھر کی پردہ نشین بی بی تھی، سارا قرآن ناظراں پڑھا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ "میرا قرآن ختم ہونے پر ہدیہ کی مجلس جو زنانہ میں ہوئی تھی وہ اس قدر دلچسپ اور عجیب تھی کہ پھر کسی ایسی مجلس میں وہ کیفیت میں نے نہیں دیکھی" قرآن پڑھنے کے بعد وہ باہر کتب میں پڑھنے لگے۔ مولوی حمید الدین ایک ذی علم اور بزرگ آدمی ان کے نانا کے ہاں نوکر تھے جنھوں نے ان کے ماموؤں کو پڑھایا تھا۔ ان سے معمولی کتابیں کریما، خالق باری، آمد نامہ وغیرہ پڑھیں۔ جب مولوی حمید الدین کا انتقال ہو گیا تو اور لوگ پڑھانے پر نوکر ہوتے رہے۔ انھوں نے فارسی میں گلستاں، بوستاں اور ایسی ہی ایک آدھ اور کتاب سے زیادہ نہیں پڑھا۔ پھر عربی پڑھنی شروع کی۔ عربی میں شرح ملا، شرح تہذیب، میبذی، مختصر معانی اور مطول ماتا قلت تک پڑھی مگر طالب علموں کی طرح نہیں بلکہ نہایت بے پروائی اور کم توجہی کے ساتھ۔ اس کے بعد ان کو اپنے خاندانی علم یعنی ریاضی پڑھنے کا شوق ہوا جس میں ان کی ننھیال کے لوگ دلی میں اپنا مثل نہ رکھتے تھے انھوں نے اپنے ماموں نواب زین العابدین خاں سے حساب کی معمولی درسی کتابیں، تحریر اقلیدس کے چند مقالے، ہیات میں شرح چغمنی تک اور ایک آدھ رسالہ متوسطات کا (جو مجسطی سے پہلے پڑھائے جاتے ہیں) پڑھا۔ مگر تمام رسالے متوسطات کے نہیں پڑھے اور نہ مجسطی کے پڑھنے کی نوبت پہنچی کیوں کہ آلات رصد کا زیادہ شوق ہو گیا تھا۔ چنانچہ آلات رصد برجندی اور چند رسالے مثل اعمال کرہ، اعمال اصطرلاب، رسالۂ صنعت اصطرلاب، ربع مجیب، ربع مقنطر، ہلزون، جریب الساعۃ، پرکار تقسیم، پرکار متناسبہ اپنے ماموں سے پڑھے۔ اسی زمانے میں طب پڑھنے کا شوق ہو گیا۔ حکیم غلام حیدر خاں سے جو ایک خاندانی حکیم تھے، طب کی ابتدائی کتابیں مثل قانونچہ اور موجز وغیرہ پڑھنے کے بعد معالجات سدیدی، شرح اسباب اور نفیسی امراض عین تک پڑھی اور چند ماہ تک ان کے پاس مطب بھی کیا۔ پھر پڑھنا چھوڑ دیا۔ جب انھوں نے پڑھنا چھوڑا ہے اس وقت ان کی عمر اٹھارہ انیس برس کی تھی۔ اس کے بعد بطور خود کتابوں کے مطالعے کا برابر شوق رہا اور دلی میں جو اہل علم اور فارسی دانی میں نام آور تھے جیسے صہبائی، غالب اور آزردہ وغیرہ ان سے ملنے کا اور علمی مجلسوں میں بیٹھنے کا اکثر موقع ملتا رہا۔ 1846 میں جب کہ وہ فتح پور سیکری سے بدل کر دلی کی منصفی پر آئے اس وقت جیسا کہ آگے ذکر کیا جائے گا، انھوں نے کسی قدر تحصیل علم میں ترقی کی۔

عنفوان شباب

سر سید کا عنفوان شباب نہایت زندہ دل اور رنگین صحبتوں میں گذرا تھا وہ راگ رنگ کی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ باغوں کی سیر کو دوستوں کے ساتھ جاتے تھے اور وہاں راگ رنگ اور دعوتوں کے جلسوں میں شامل ہوتے تھے۔ ہولی کے جلسوں اور تماشوں میں جاتے تھے۔ پھول والوں کی سیر میں خواجہ صاحب پہنچتے تھے اور وہاں کی صحبتوں میں شریک ہوتے تھے۔ دلی میں بسنت کے میلے جو موسم بہار کے آغاز میں درگاہوں پر ہوتے تھے وہاں جاتے تھے۔ خود ان کے نانا خواجہ فرید کی قبر پر چونسٹھ کھمبے میں جو بسنت کا میلا ہوتا تھا اس میں وہ اپنے اور بھائیوں کے ساتھ منتظم و مہتمم ہوتے تھے۔

اس زمانے میں خواجہ محمد اشرف ایک بزرگ دلی میں تھے۔ ان کے گھر پر بسنت کا جلسہ ہوتا تھا۔ شہر کے خواص وہاں مدعو ہوتے تھے۔ نامی نامی طوائف زرد لباس پہن کر وہاں آتی تھیں۔ مکان میں بھی زرد فرش ہوتا تھا۔ دالان کے سامنے ایک چبوترہ تھا جس میں حوض تھا۔ اس حوض میں زرد ہی پانی کے فوارے چھوٹتے تھے۔ صحن میں جو چمن تھا اس میں جھڑاں زرد پھول کھلے ہوئے ہوتے تھے اور طوائف باری باری بیٹھ کر گاتی تھیں۔ سر سید کہتے تھے کہ "میں ہمیشہ وہاں جاتا تھا اور اس جلسے میں شریک ہوتا تھا۔"

خود سر سید کے ماموں نواب زین العابدین خاں کے مکان پر بڑے بڑے نامی گویے دھرپت اور خیال گانے والے جمع ہوتے تھے۔ میر ناصر احمد جو دلی میں مشہور بین بجانے والے تھے وہ آتے تھے۔ گانا ہوتا تھا اور بین بجتی تھی۔ اسی طرح خواجہ میر درد کے سجادہ نشین ہر مہینے کی چوبیسویں کو رات کے وقت ایک درویشانہ جلسہ کیا کرتے تھے۔ اس میں بھی بڑے بڑے نامی گویئے آتے تھے۔ دھرپت اور خیال گاتے تھے اور میر ناصر احمد جو اسی خاندان میں بیعت تھے بین بجانے میں اپنا کمال دکھاتے تھے۔ ان سب جلسوں میں سر سید اکثر شریک ہوتے تھے۔

ایک اور جلسہ رائے پران کشن کے مکان پر ہوتا تھا جو ایک معزز رئیس اور نہایت وضعدار تھے جتا نامی ایک طوائف نہایت خوش آواز دھرپت اور خیال گانے اور بین بجانے میں مشہور تھی۔ وہ اپنا پیشہ چھوڑ کر رائے پران کشن کے گھر میں پڑ گئی تھی، اس کی خاطر سے وہ ہر مہینے کی سترھویں کو ایک جلسہ کیا کرتے تھے۔ شہر کے رئیس جن سے ان کی دوستی تھی، بلائے جاتے تھے۔ بڑے بڑے گویئے، بہادر خاں ستارن اور میر ناصر احمد سب جمع ہوتے تھے۔ سر سید کہتے تھے کہ "میرے ماموں نواب زین العابدین خاں ہمیشہ اس جلسہ میں جاتے تھے۔ میں بھی بارہا ان کے ہمراہ گیا ہوں۔"

جب وہ نوکر ہو کر آگرہ گئے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ صدر دیوانی عدالت آگرہ میں موجود ہے اور وہاں منشی امیر علی خاں، مولوی غلام امام شہید، مولوی

غلام جیلانی، مولوی محمد شفیع اور اور بہت سے اشراف خاندانوں کے نامی وکیلوں اور عہدیداروں کا مجمع ہے۔ یہ سب لوگ نہایت زندہ دل مرنج و مرنجان اور زندگی بے فکری و فارغ البالی کے ساتھ ہنسی اور خوشی میں گذارنے والے تھے۔ تاج گنج، اعتماد الدولہ اور نور افشاں میں وہ آئے دن عیش و نشاط کے جلسے کرتے تھے۔ سرسید نے بھی ان جلسوں کی کیفیتیں دیکھی تھیں اور ان میں شریک ہوئے تھے۔

سرسید جیسے بڑھاپے میں بذلہ سنج تھے جوانی میں اس سے بھی زیادہ ظرافت اور حاضر جوابی ان کی طبیعت میں تھی۔ دلی میں ایک مشہور طوائف شیریں جان نامی نہایت حسین تھی مگر سنا ہے کہ اس کی ماں بھدی اور سانولے رنگ کی تھی۔ ایک مجلس میں جہاں وہ اپنی ماں کے ساتھ مجرے کے لیے آئی تھی سرسید بھی موجود تھے اور وہیں ان کے ایک قدحاری دوست بھی بیٹھے تھے۔ وہ اس کی ماں کو دیکھ کر بولے "مادرش بسیار تلخ ست" سرسید نے یہ مصرع پڑھا "گرچہ تلخ ست ولیکن بر شیریں دارد"

سرسید کا مذکورۂ بالا جلسوں اور صحبتوں میں شریک ہونا آخر کار رنگ لائے بغیر نہ رہا۔ اگر چہ اس وقت تک دلی کے مسلمانوں میں قدیم سوسائٹی کی بہت سی خوبیاں باقی تھیں لیکن چونکہ ان کے اقبال کا خاتمہ ہو چکا تھا اس لیے ان کی سوسائٹی میں ان خرابیوں کی آہستہ آہستہ بنیاد پڑتی جاتی تھی جن کو تنزل اور ادبار کا پیش خیمہ سمجھنا چاہیے۔ طبیعتیں عموماً عیش و نشاط اور راگ رنگ کی طرف مائل ہوتی جاتی تھیں۔ بے فکر امیر زادے عیاشی اور لہو و لعب کی مثالیں قائم کرتے جاتے تھے اور خربوزوں کو دیکھ کر خربوزے رنگ پکڑتے جاتے تھے۔ اگر چہ سرسید سترہ یا اٹھارہ برس کی عمر میں متاہل ہو گئے تھے پھر بھی وہ اس متعدی مرض کے اثر سے اپنے تئیں نہ بچا سکے۔ لیکن جیسا کہ معتبر ذریعوں سے معلوم ہوا ہے، باوجود غایت وابستگی کے جو جنون سے کسی طرح کم نہ تھی، سرسید نے جس حیرت انگیز طریقہ سے اپنے تئیں اس دلدل سے نکالا وہ درحقیقت ان کی زندگی کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے جس کو ان کی اخلاقی طاقت کا سب سے پہلا کرشمہ سمجھنا چاہیے۔ گویا یہ شعر اس وقت ان کے حسب حال تھا:

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

مولانا جلال الدین رومی کے سامنے ایک زاہد کی اس طرح تعریف کی گئی کہ اس نے تمام عمر میں کسی برے کام کا ارتکاب نہیں کیا۔ مولانا نے "یہ سن کر فرمایا" کاش کردے وگزشتے" یعنی نسبت اس کے کہ آدمی عمر بھر کوئی برا کام نہ کرے اور ایک حالت پر ٹھہرا رہے۔ یہ بہت بہتر ہے کہ وہ برے کام کا ارتکاب کر کے حالت موجودہ سے ترقی کر جائے۔ مولانا کا یہ ارشاد جیسا سرسید کے حال پر منطبق ہوتا ہے اس سے بہتر شاید ہی کوئی اس کا مصداق ہو سکے۔

منجملہ دیگر اسباب کے جو اس تبدیلی حالت کے باعث ہوئے سب سے بڑا سبب سرسید کے بڑے بھائی کا قبل از وقت انتقال کرنا تھا۔ دونوں بھائیوں میں محبت اور اتحاد اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ شہر میں اس کی نظیر دی جاتی تھی۔ سرسید کے بھائی کا یہ قول تھا کہ "کیسی ہی عیش و نشاط کی مجلس ہو اگر سید وہاں نہ ہو تو مجھ کو وہ مجلس جہنم معلوم ہوتی ہے۔" ایسا ہی حال سرسید کا اپنے بھائی کے ساتھ تھا۔ چنانچہ بھائی کے مرتے ہی ان کا دل رنگین صحبتوں سے بالکل اچاٹ ہو گیا، لباس اور وضع میں جو اس وقت بانکپن سمجھا جاتا تھا یک قلم ترک کر دیا۔ سر گھٹوا لیا، ڈاڑھی چھوڑ دی، پائچے متشرع کر لیے، کرتا پہن لیا، رنگین طبع نوجوانوں کی صحبت رفتہ رفتہ کم ہونے لگی اور روز بروز مولویت کا رنگ چڑھنے لگا کہ اس وقت قوم میں یہی اعلیٰ درجہ ترقی انسانی کا سمجھا جاتا تھا اور اگر غور کر کے دیکھا جائے تو اصلی ترقی تک پہنچنے کے لیے اس مرحلے کا طے کرنا نہایت ضرور ہے جیسا کہ کہا گیا ہے۔

حور و جنت جلوہ برزاہد کند در راہِ دوست
اندک اندک عشق درکار آورد بیگانہ

سرسید نے بھی اپنی ایک تحریر میں اس نوجوانی کی لغزش کی طرف اشارہ کیا ہے وہ قوم کی غفلت و بدمستی کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں "ہم بھی اسی رنگ میں مست تھے، ایسی گہری نیند سوتے تھے کہ فرشتوں کے بھی اٹھائے نہ اٹھتے تھے۔ کیا کیا خیالات ہمارے قوم کے ہیں جو ہم میں نہ تھے اور کون سی کالی گھٹائیں ہماری قوم پر چھا رہی ہیں جو ہم پر چھائی ہوئی نہ تھیں۔ جب رندھے تو فرہاد بڑھ کر تھے جب زاہد خشک تھے تو نہایت ہی اکھڑ تھے۔ جو صوفی تھے تو رومی سے برتر تھے اور اپنی قوم کے غمخوار۔"

مگر سرسید کے بعض نہایت ثقہ رشتہ داروں سے سنا گیا ہے کہ انھوں نے جو کچھ اس غفلت کے زمانے میں کیا اس سے معدودے چند کے سوا کوئی تنفس واقف نہیں ہوا۔ وہ خود اسی معاملہ کے متعلق اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں "وہ ایک عجیب قسم کا زمانہ تھا۔ اس زمانے کے اشراف خاندانوں کے نوجوان جو کچھ کرتے تھے ایسی طرح پر کرتے تھے کہ کوئی اس سے واقف نہ ہوتا تھا اور پردہ ڈھکا رہتا تھا۔ کوئی حرکت عام طور پر برملا ہونے نہیں پاتی تھی۔ اس زمانے کے اشراف نوجوانوں کا عملدرآمد اس مقولہ پر تھا کہ "اپنے جسم کے زخم کو ڈھانکے رکھو تاکہ لوگ اسے دیکھ کر نفرت نہ کریں۔" یہ ایک ایسی اچھی نصیحت ہے کہ گو انسان سے کوئی برائی ہو مگر اس برائی کا برا ہونا دل سے نہیں جاتا اور انسان کے لیے یہی رستہ برائی سے نکلنے کا ہے۔"

□□□

خواجہ غلام السیدین — ہماری مطبوعات سے — ''آندھی میں چراغ'' سے ماخوذ

قوموں کی تقدیر

اگر ہم تاریخ کی ورق گردانی کریں تو بار بار یہ تماشا نظر آتا ہے کہ قومیں پیدا ہوتی ہیں، عروج حاصل کرتی ہیں، تمدن کے سرمائے میں کچھ اضافہ کرتی ہیں، پھر رفتہ رفتہ ان کا زوال شروع ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ آخر میں صرف ان کا افسانہ عبرت تاریخ کے صفحوں میں محفوظ رہ جاتا ہے۔ کیا یہ بھی انسان کے مرنے جینے اور سورج کے نکلنے ڈوبنے کی طرح ایک اٹل اور ناگزیر فطری حادثہ ہے جس میں انسان کے دست قدرت کو کوئی دخل نہیں۔ یا اس میں کسی سماجی اور اخلاقی قانون کی کارفرمائی ہے۔ میرے خیال میں قوموں کے عروج و زوال کو کسی بیرونی طاقت کا تابع قرار دینا ناسمجھی کا ثبوت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قومیں خود اپنے عمل سے اپنا حال اور مستقبل بناتی ہیں اور اپنی ہی بداعمالیوں سے تباہ ہوتی ہیں۔ قدرت کا قانون تو انصاف پر مبنی ہے۔ وہ نہ کسی قوم پر ظلم کرتا ہے نہ اس کی بے جا ناز برداری۔ قرآن شریف کے الفاظ میں اس حقیقت کو یوں بیان کیا گیا ہے۔ ''خدا کسی قوم کی حالت کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی اندرونی صلاحیتوں کو تبدیل نہ کرے۔'' حالی نے اس نکتہ کو اپنی مسدس میں یوں بیان کیا ہے:

جو کچھ ہیں وہ سب اپنے ہی ہاتھوں کے ہیں کرتوت
شکوہ ہے زمانے کا نہ قسمت کا گلا ہے
دیکھے ہیں یہ دن اپنی ہی غفلت کی بدولت
سچ ہے کہ برے کام کا انجام برا ہے

لہٰذا مسئلے کی یہ صورت بن جاتی ہے کہ قوموں کے لیے نیک عملی اور بدعملی کے معیار کیا ہیں؟ کون سے اسباب ہیں جو ان کی زندگی میں قوت اور حسن پیدا کرتے ہیں، اور کون سے کمزوری بداخلاقی اور زوال کی طرف لے جاتے ہیں؟ قدرت نے افراد اور جماعتوں کو مختلف قسم کی جسمانی، دماغی اور اخلاقی قوتیں اور مادی وسائل عطا کیے ہیں اور کامیابی کے لیے یہ شرط رکھی ہے کہ وہ ان کو ضائع نہ کریں بلکہ ایک قیمتی امانت سمجھ کر ان سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔ مذہب کی اصطلاح میں کسی نعمت کے مناسب استعمال کو ''شکر'' کہتے ہیں۔ جو قومیں شکر کا فرض ادا کرتی ہیں اور اپنی دولت، علم اور وقت کو کفایت اور معقولیت کے ساتھ استعمال کرتی ہیں ان کی قوتیں فروغ پاتی ہیں اور دنیا میں کامیابی حاصل کرتی ہیں۔ برخلاف اس کے جو قومیں ان نعمتوں کا غلط استعمال کرتی ہیں ان کی قومیں مضمحل ہوکر رہ جاتی ہیں۔ یہی مکافات عمل یا جزا اور سزا کا قانون ہے۔ ''اگر تم شکر کروگے تو تمھاری نعمتوں میں اضافہ کروں گا۔ لیکن کفران نعمت کروگے تو میرا عذاب بھی سخت ہے۔'' مگر یہ عذاب خدا کی طرف سے براہ راست نازل نہیں ہوتا۔ قوانین قدرت کا نتیجہ ہوتا ہے جو آتش فشاں پہاڑ کی طرح چپ چاپ اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ قومیں جو بظاہر خوشحال اور طاقت ور معلوم ہوتی ہیں، دفعتاً قانون کی زبردست پکڑ میں آکر خاک میں مل جاتی ہیں۔ اس تعزیر میں دیر لگ سکتی ہے مگر اس سے چھٹکارا ممکن نہیں۔ جوں جوں کسی قوم میں جدوجہد، فکر و عمل اور سعی وطلب کی صلاحیت کم ہوتی ہے۔ اس کے عبرتناک انجام کا سایہ بڑھنا اور پھیلنا شروع ہوجاتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قوم میں حیات صالح کی بنیاد ڈالنے کے لیے کیا شرائط ضروری ہیں۔ میرے خیال میں قومی ترقی کے لیے سب سے مقدم شرط یہ ہے کہ قومی زندگی کی بنیاد سماجی انصاف کے اصولوں پر رکھی جائے۔ اس بنیادی صفت کے بغیر اور تمام کمالات بے کار ہیں یا بے کار ہو

''آندھی میں چراغ'' ممتاز ادیب اور ماہر تعلیم خواجہ غلام السیدین کے مختلف مضامین کا مجموعہ ہے جو تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں 'مہاتما بدھ' حضرت محمدؐ، حضرت امام حسینؓ اور گرونانک کی تعلیمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں صحبتِ اہلِ صفا کے عنوان کے تحت مہاتما گاندھی، مولانا آزاد، سید راس مسعود، علامہ اقبال، خواجہ غلام الثقلین جواہر لال نہرو اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے افکار و نظریات سے واقف کرایا ہے۔ ''مستقبل کی پرچھائیاں'' کے زیر عنوان تیسرے حصے میں مصنف نے ان اقدار وعوامل کا ذکر کیا ہے جن پر عمل کر کے ہم اپنی اور ملک کی ترقی کو یقینی بنا سکتے ہیں۔ قومی اردو کونسل کی شائع کردہ376 صفحات کی اس کتاب کی قیمت73 روپئے ہے۔ کونسل اپنی مطبوعات پر طلبہ کو 45فیصد اور اساتذہ کو 40 فیصد کی خصوصی رعایت دیتی ہے۔

جاتے ہیں۔ جس سماج میں انصاف نہیں ہوتا وہاں تلوار اور قلم، ادب اور آرٹ، دولت اور تجارت، قوت اور حکومت سب کو کوئی چیز اندر ہی اندر گھن کی طرح کھاتی رہتی ہے یہاں تک کہ ایک روز یہ ساری عمارت نیچے آ پڑتی ہے۔ قدیم یونانیوں کی تہذیب جس میں علم اور آرٹ کی ہم آہنگی نے ایک خاص شان دلفریبی پیدا کر دی تھی اور قدیم رومی تہذیب جو اپنی وسیع مملکت تدبر اور سیاسی قوت پر نازاں تھی کیوں تباہ ہوئیں؟ اس لیے کہ ان میں تمام انسانوں کا بحیثیت انسان کے احترام نہ تھا اور ان کی دیدہ زیب سطح کے نیچے بے شمار ایسے غریبوں اور مظلوموں کی تاریک زندگیاں دبی ہوئی تھیں جو تہذیب کی روشنی اور عام انسانی حقوق دونوں سے سراسر محروم تھے۔ مگر مثالوں کے لیے ماضی میں جانے کی کیا ضرورت ہے؟ آج بھی مغربی تہذیب کی ناکامی کا عبرت انگیز نظارہ ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہے، وہاں ایک طرف سائنس اور صنعت و حرفت کی ترقی اور انسانی دماغ کی خلاقی نے انسان کی کام کرنے اور دولت پیدا کرنے کی صلاحیت کو سیکڑوں گنا بڑھا دیا ہے اور دوسری طرف سرمایہ داری کے مظالم اور انسان دشمنی کی بدولت بڑے بڑے گروہ بلکہ ملک کے ملک، مفلسی، جہالت اور بے کاری میں گرفتار ہیں۔ انسان کے پاس آج ایسے علمی اور مادی وسائل موجود ہیں جن کی مدد سے وہ غربت اور بے کاری کا خاتمہ کر سکتا ہے۔ بیماریوں کا انسداد کر سکتا ہے۔ لوگوں کے لیے رہنے کو مکان، پہننے کو کپڑا، پڑھنے کو کتابیں مہیا کر سکتا ہے لیکن چونکہ سماجی رشتوں میں انصاف کی کارفرمائی نہیں اس لیے سائنس کی ترقی بڑی حد تک بے کار اور خوش حالی اور امن و امان مفقود ہیں۔ اسی صنعت و حرفت کی ترقی اور نقل و حرکت کی آسانی اور تیزی کی وجہ سے قوموں میں باہمی وابستگی اور انحصار کلی کا ایک نیا احساس پیدا ہو گیا ہے، ان حالات میں دولت اور دوسرے مادی اور تہذیبی وسائل کی مناسب تقسیم نہ صرف انصاف اور اخلاق کی رو سے ضروری ہو جاتی ہے بلکہ عملاً بھی اس کے بغیر چارہ نہیں۔ لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب قوم کے تمام افراد میں ایکا ہو اور ان میں سے ہر ایک جماعت کی عزت میں اپنی عزت اور جماعت کی ذلت میں اپنی ذلت سمجھے اور نفسی نفسی کے بجائے انصاف کے اصول پر عمل کرے۔ ورنہ خود غرضی، تعصب اور نفاق کا دور دورہ ہو جاتا ہے جو زوال کا یقینی پیش خیمہ ہے۔

قومی ترقی کے لیے دوسری اہم شرط محنت، جفاکشی اور کسب حلال کی عادت ہے۔ افراد کی طرح جماعتوں کی صحت کے واسطے بھی حرکت اور جدوجہد ضروری ہے۔ جب کوئی قوم عمل اور جدوجہد کی زندگی سے جی چرانے لگتی ہے اور اس کے افراد عیش و عشرت یا گوشہ نشینی کو ترجیح دیتے ہیں تو اس کی قوتیں معطل ہو جاتی ہیں اور جسمانی اور ذہنی کاہلی کی عادت پڑ جاتی ہے۔ لوگ کام کو عار سمجھنے لگتے ہیں اور محنت کر کے روزی کمانے کی بجائے پیری، مریدی، درویشی اور مجاوری کے پھیر میں پڑ جاتے ہیں یا رئیسوں کی مصاحبت اور دربار داری اور خوشامد کے ذلیل پیشے کو اختیار کر لیتے ہیں۔ اس طرح ''مقدس گداگروں'' کی ایک جماعت پیدا ہو جاتی ہے جو کوئی عملی یا تخلیقی کام کرنے کے بجائے مختلف بہانوں سے خدا کے نام پر دوسروں کی کمائی بٹورتے ہیں۔ ان میں سوال کی عادت پیدا ہو جاتی ہے جو خودی اور خودداری کے لیے سم قاتل کا حکم رکھتی ہے۔ اس ناکردہ کار جماعت میں ان سب کے علاوہ وہ دولت مند طبقہ بھی شامل ہے جو بن کمائی دولت پر عیش کرتا ہے اور کسی شکل میں بھی جماعت کا قرض ادا نہیں کرتا۔ جوں جوں قوم میں ایسے تن آسان اور بے کار افراد کی تعداد زیادہ ہوتی جاتی ہے اسی قدر اس کے زوال کے دن قریب آتے جاتے ہیں۔ اسی لیے انصاف اور دانشمندانہ خود غرضی دونوں کا تقاضا ہے کہ قومی زندگی کی تنظیم میں سب سے مقدم جگہ ان بندگان خدا کو دی جائے جن کی محنت اور جفاکشی پر ہماری تہذیب و تمدن کا انحصار ہے اور گرمیٔ محفل کے لیے نہیں بلکہ درحقیقت سیاست کا اصول یہ ہو کہ جس کھیت سے خود محنت کش دہقان کو روزی میسر نہ ہو اس کے ہر دانۂ گندم کو جلا دیا جائے۔

یونان، مصر اور روم کی قدیم تہذیبیں بڑی شان و شوکت کے ساتھ اٹھیں۔ ان کے زوال کا ایک سبب تو سماجی رشتوں میں انصاف کی کمی تھی۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ کچھ مدت تک قوت اور شوکت کی زندگی بسر کرنے کے بعد یہ قومیں کاہلی، عیش و عشرت اور بے کاری میں پڑ گئیں اور سعی و عمل کی گرمی کے بجائے ارباب نشاط کی محفلیں گرم ہونے لگیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قدرت کے اٹل قانون نے کروٹ لی اور دیکھتے دیکھتے ان کی قوت اور عظمت کو خاک میں ملا دیا۔ میں نے کچھ عرصہ ہوا برما کے متعلق ایک کتاب پڑھی تھی جس کا نام مجھے بہت پسند آیا تھا A World That Works (ایک ایسی دنیا جو کام کرتی ہے) دراصل یہ عنوان قوموں کی زندگی اور موت کے لیے ایک کسوٹی ہے۔ جو قومیں کام کریں گی زندہ رہیں گی۔ جو کام سے جی چرائیں گی اور اس کو ایک بار سمجھ کر دوسری جماعتوں یا قوموں پر ڈالنے کی کوشش کریں گی وہ فنا ہو جائیں گی اور کم از کم میں ان پر آنسو بہانے کو تیار نہیں ہوں! کام تو زندگی کی قیمت ہے اور جو شخص یا جو جماعت اس قیمت کو ادا کرنے سے گریز کرتی ہے اس کی میرے دل میں اتنی ہی عزت ہے، جس قدر کسی چور یا اچکے کی۔

جب انصاف، محنت، سادگی اور کفایت شعاری کی بنیادوں پر قومی زندگی کی عمارت کھڑی ہو جائے تو اس میں قوت، حسن و خوبی اور نظم و ترتیب پیدا کرنے کے لیے افراد قوم میں تین صفات کی ضرورت ہوتی ہے۔ جرأت، رواداری اور ڈسپلن۔ جرأت زندگی کی علامت ہے۔ اس کی بدولت قوم میں حوصلہ اور مشکلات کو جھیلنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے خوف جو جرأت کی ضد ہے، زندگی کے پر قینچ کر دیتا ہے۔ دوسری صفت رواداری ہے

جس کے بغیر انفرادیت کی تکمیل ناممکن ہے اور قومی زندگی میں تنوع کی شان پیدا نہیں ہوسکتی۔ خدا کی دنیا میں یکسانیت نہیں اور اختلافات انسانی فطرت کا جزو ہیں۔ اگر کسی قوم میں رواداری کا جذبہ نہ ہوتو یہ اختلافات مخالفت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور ہر گروہ دوسروں پر زبردستی ایک خاص قسم کی یکسانیت عائد کرنا چاہتا ہے جو ترقی کے راستے میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ ڈسپلن اس لیے ضروری ہے کہ اس کے بغیر کوئی کام نظم و ترتیب اور خوش اسلوبی کے ساتھ نہیں ہو سکتا اور افراد اور جماعتوں میں خواہ مخواہ رسہ کشی ہوتی رہتی ہے جس میں ان کی قوت ضائع ہوتی ہے لیکن اصلی ڈسپلن وہ ہے جو کوئی بیرونی طاقت یا کوئی جابر حاکم قوم پر باہر سے عائد نہ کرے بلکہ وہ آزادی کی فضا میں خوش دلی کے ساتھ کام کرنے اور اتحاد مقاصد کا نتیجہ ہو۔

ممکن ہے آپ کہیں کہ ان سب صفات کی اہمیت تسلیم لیکن ان کی تربیت کیسے کی جائے۔ میرے خیال میں بڑے پیمانے پر قومی اور شخصی کیرکٹر کی تشکیل کے لیے چند شرائط کا پورا ہونا ضروری ہے جن میں سب سے مقدم شرط یہ ہے کہ قوم کے سامنے کوئی بڑا نصب العین ہو، جس کو بیشتر لوگ خوشی سے مانیں اور جو ان کی تنظیم اور وحدت کے لیے ایک مرکز کا کام دے اور ان کے فکر و عمل پر حاوی ہو جائے۔ جب کبھی کسی قوم نے عروج حاصل کیا ہے ایسے ہی کسی آدرش نے اس کے لیے قوت محرکہ کا کام دیا ہے۔ مثلاً پرانے زمانے میں ہندوؤں کے سامنے معرفت حق کا نصب العین تھا یعنی اس ابدی اور ازلی حقیقت تک رسائی کی کوشش جس کے مقابلے میں دنیاوی زندگی کی حقیقت ایک پرچھائیں سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی۔ بدھ مت نے تہذیب نفس کو اپنا مطمح نظر بنایا تھا۔ قدیم یونانیوں نے اپنی زندگی اور تہذیب میں خیر، حق اور حسن کے تصورات کو سمونے کی کوشش کی تھی۔ رومیوں نے انسانی تمدن کے سرمائے میں قانون، انصاف اور سیاسی امن کے تصورات کا اضافہ کیا تھا۔ مسلمانوں نے اپنے سامنے انسانی وحدت، انصاف، اخوت اور مساوات کا نصب العین رکھا تھا اور تاریخ کے اس تاریک دور میں ایک شمع روشن کی تھی جس کی چھوٹ آج تک ہم پر پڑتی ہے لیکن ان تمام آدرشوں کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ یہ بعض خاص علمی، اخلاقی، سماجی یا جمالی قدروں کے حامل ہیں...... ورنہ محض دولت یا سیاسی طاقت پیدا کر لینا اور اس کے ذریعے دوسری قوموں کو غلام بنا کر خدا کی زمین میں فتنہ و فساد پیدا کرنا عظمت کی دلیل نہیں، حیوانیت کا ثبوت ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یونانی سقراط، افلاطون اور ارسطو سے زیادہ سکندر پر فخر کرتے، چنگیز خاں کے وحشی مغل ہمارے احترام کے مستحق ہوتے اور ہٹلر کی جہانگیری کا جنون اور انگریزوں کی عالمگیر سلطنت کا قیام، گوئٹے اور شکسپیئر، حافظ اور نیوٹن کے علمی اور ادبی کارناموں سے کہیں زیادہ قابل قدر شمار کیا جاتا!

لیکن محض ایک نصب العین کا تعین کافی نہیں کیوں کہ عام لوگوں کے لیے کسی مجرد تصور میں کافی جاذبیت نہیں ہوتی۔ خواہ وہ قوت و شوکت کا ہو یا حسن و جمال کا یا انصاف اور خدمت کا۔ اس تصور کو حقیقت کا جامہ پہنانے کے لیے ضروری ہے کہ قوم کو ٹھیک وقت پر کوئی ایسا لیڈر میسر آ جائے جس کی تمام زندگی اور عمل اس نصب العین کی تفسیر ہو، کیونکہ ایک سچے اور پرخلوص اور بےلوث انسان کی ذات ہی میں وہ کشش ہوتی ہے جو لاکھوں آدمیوں کے دل و دماغ میں انقلاب پیدا کر سکتی ہے۔

چڑھتی ہے جب عشق کی سان پہ تیغ خودی
ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کار سپاہ!

اس کے فیض صحبت سے رفتہ رفتہ قوم میں ایسے مخلص کارکنوں کی ایک جماعت پیدا ہو جاتی ہے جو نیکی اور سچائی کو اپنا مقصدِ حیات بنا لیتے ہیں۔ جاہ و منصب کی رشوت اور دولت و قوت کا لالچ ان کی نیت میں خرابی اور ان کے قدم میں لغزش پیدا نہیں کر سکتے۔ تاریخ عالم میں آج تک کوئی سیاسی یا سماجی یا مذہبی تحریک کامیاب نہیں ہوئی اور نہ کسی قوم کو عروج حاصل ہوا جب تک اس میں کوئی ایثار پیشہ جماعت عوام کی بے غرض خدمت کے لیے کمربستہ نہ ہوئی ہو۔ کہنے والے تو یہ کہتے ہیں کہ ایسے ہی لوگوں کی برکت سے زمین اپنے محور پر قائم ہے، لیکن جب کسی قوم میں نیک اور بےنفس خدمت کرنے والوں کی جماعت باقی نہیں رہتی تو ان کا اخلاقی اور مادی زوال شروع ہو جاتا ہے یہاں تک قانون قدرت کے مطابق کوئی دوسری قوم ان کی جگہ لے لیتی ہے جس میں جدوجہد، خدمتِ خلق اور شکرانِ نعمت کی بہتر صلاحیت ہوتی ہے۔ فطرت اکثر ایسی قوموں کو لمبی مہلت بھی دیتی ہے لیکن رفتہ رفتہ جب بداعمالیوں کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے جزائے عمل کا قانون دفعتاً ان کو پکڑ لیتا ہے جب کہ وہ غفلت میں سرشار ہوتے ہیں" قوموں نے اپنے ہاتھوں سے جو کچھ کمایا تھا آج اس کی پاداش میں خشکی اور تری میں فتنہ و فساد برپا ہو گیا ہے تاکہ لوگ اپنے اعمال کا پھل چکھیں۔ شاید ان کو اس سے عبرت ہو اور وہ راہِ راست کی طرف آ جائیں۔" (قرآن شریف)

ظاہر میں ہمارے زمانے کی موجودہ کشمکش میں قوت کی کشمکش معلوم ہوتی ہے یعنی جس قوم یا جن قوموں کے پاس زیادہ سامان جنگ اور دولت اور صنعت و حرفت کے وسائل ہوں گے وہ اس مقابلے میں کامیاب ہوں گی گویا کامیابی کا مطلب محض وسائل کی فراوانی یا جنگ کی کامیابی ہے، لیکن یہ خیال صحیح نہیں۔ بیسویں صدی میں ہتھیاروں کی جنگ میں کوئی قوم کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس میں تو فاتح اور مفتوح دونوں کی ہار ہے اور دنیا کی تباہی۔ لہٰذا اگر مقابلہ اس محاذ پر ہوا تو ہار جیت کے الفاظ بے معنی ہوں گے۔ لیکن اگر صورت حال کو گہری نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اصلی مقابلہ قدروں کا مقابلہ

ہے، اخلاقی اصولوں کا مقابلہ ہے۔ مقابلہ اسی میدان میں ہے (یا ہونا چاہیے) کہ کون سا نظام انسانوں کے لیے ایک بہتر اور بھرپور زندگی مہیا کر سکتا ہے جس میں انھیں اپنی صلاحیتوں کو فروغ دینے کا موقع ملے۔ اس نظام کی ترتیب میں دور حاضرہ کے جدید تقاضوں سے باخبر رہنا ضروری ہے۔ دنیا کے حالات بہت تیزی کے ساتھ بدلے ہیں اور بدل رہے ہیں۔ اب لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دینے کے بجائے منصوبہ بندی اور اجتماعیت کا دور دورہ ہے جس کے نقوش سوشلسٹ ملکوں میں بہت واضح اور نمایاں ہیں اور دوسرے ملکوں میں بھی رفتہ رفتہ ابھرتے جاتے ہیں۔ ہم ان مطالبات کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ تبدیلی اور انقلاب، زندگی کی فطرت میں شامل ہیں جس قوم یا جماعت میں انقلاب سے متاثر ہونے کی صلاحیت نہیں رہتی وہ زندگی کی دوڑ میں مات کھا جاتے ہیں اور بازار عالم میں اس کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ:

یاں نکلے ہیں سودے کو درم لے کے پرانے
اور سکہ رواں ملک میں مدت سے نیا ہے!

لیکن اجتماعیت بھی بجائے خود ہر مرض کی دوا نہیں اس میں بھی ظلم، حق تلفی، انسان دشمنی اور بے جا تصرف کی گنجائش ہے۔ نسلی غرور تحکم اور ملوکیت اس کو بھی مسخ کر سکتے ہیں۔ انصاف اور آزادی اور امن اس بت کی بھینٹ بھی چڑھائے جا سکتے ہیں۔ اصلی سوال یہ ہے کہ کون سی قوم یا قومیں اس نئے نصب العین کی روشنی میں سائنس اور صنعت و حرفت کی حیرت انگیز طاقتوں کو تمام بنی نوع انسان کے فائدے کے لیے استعمال کریں گی؟ کیا ہندوستان ایسا کر سکے گا؟ کیا امریکہ میں اس کی صلاحیت ہوگی؟ کیا روس کی سماج سیوا اور سماجی مساوات کی کوشش شہنشاہیت کی لعنت سے محفوظ رہیں گی؟ کون کہہ سکتا ہے؟ وقت ہی اس کا جواب دے گا۔ لیکن اس بات کا مجھے یقین ہے کہ قوموں اور افراد کی زندگی میں امن اور خوشی صرف اسی صورت میں راہ پا سکتی ہے جب وہ اخلاق اور شرافت کے بنیادی اصولوں کو برتنا سیکھیں۔ کوئی دوسری چیز بھی قوت ہو یا دولت یا سائنس، اس کا بدل نہیں ہو سکتی۔ اقبال نے لکھا ہے:

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی قوم کے اقبال کا آغاز جدوجہد اور سعی و طلب سے ہوتا ہے اور اس کا انجام عیش و عشرت پر۔ البتہ اتنا یاد رکھیے کہ اقبال کی ''شمشیر و سناں'' میں خونریزی کی تلقین نہیں، جفاکشی، سخت کوشی اور خدمت خلق کی طرف اشارہ ہے۔ اسی لیے ان کے استعمال پر ایک بہت کڑی شرط عائد کی گئی ہے۔

ہر کہ خنجر بہر غیر اللہ کشید
تیغ او در سینۂ او آرمید

یعنی اگر دولت اور ملک گیری کی ہوس میں تلوار اٹھائی جائے تو انشاء اللہ وہ تلوار خود ان کے سینے میں اتر جائے گی اور شاید اس سے کہیں بہتر ہوگا کہ قوم طاؤس کے بے کار شغل ہی میں الجھی رہے۔

□□□

تیز تر اور دور تر (نقل و حمل کی کہانی)

مصنف: میر نجابت علی/ مترجم: مہ جبیں اختر

نقل و حمل انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ پیٹ بھرنے سے لے کر مختلف افراد سے ملنے اور دیگر ضروریات کے تحت ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا انسان کا شوق بھی ہے اور مجبوری بھی۔ زیرِ نظر کتاب میں ذرائع نقل و حمل کے مسلسل ارتقائی سفر سے واقف کرایا گیا ہے۔

صفحات: 82، قیمت: 28 روپے

جنگلات کی کاشت

مصنف: ایس. کوندراس/ مترجم: مسرت جہاں

جنگل ہمارے لیے اتنے ہی ضروری ہیں جتنی ندیاں، پہاڑ اور دیگر قدرتی اشیا۔ یہ نہ صرف ماحولیاتی توازن برقرار رکھنے میں معاون ہیں بلکہ کئی اہم صنعتوں کا دار و مدار بھی ان پر ہوتا ہے۔ اس کتاب میں مختلف جنگلی درختوں اور جنگل سے متعلق مختلف پہلوؤں سے واقف کرایا گیا ہے۔

صفحات: 95، قیمت: -/24 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45% اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-066 110

زبیر احمد بھاگلپوری

فائر انجینئرنگ میں کیریئر

آج چونکہ روزگار کے مواقع کے تناسب میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کی تعداد زیادہ تیزی سے بڑھ رہی ہے، ہمارے ملک میں نئی نسل کے درمیان کامیابی حاصل کرنے کی غرض سے مسابقتی رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ ایسے میں طلبہ کو ہائی اسکول کے بعد ہی اپنے مستقبل کے کیریئر کے لیے نشانہ طے کر لینا ضروری ہے۔ بے روزگاری کے مسئلے کے باوجود آج کے دور میں آپ کی لگن اور کوشش اگر صحیح سمت میں اور صحیح رخ پر ہو تو آپ کی کامیابی یقینی ہے کیونکہ ابھی بھی تعلیم کے کئی ایسے شعبے ہیں جہاں آپ اپنے مستقبل کے خوابوں کی تعبیر نکال سکتے ہیں۔ انھیں میں ایک شعبہ فائر انجینئرنگ (Fire Engineering) کا ہے۔ یہ ایک ایسا شعبہ ہے جہاں روزگار کے اچھے مواقع دستیاب ہونے کے باوجود لوگوں کو اس کی جانکاری بہت کم ہے۔ ذیل میں فائر انجینئرنگ کے شعبے میں دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اجمالی معلومات فراہم کی جا رہی ہے۔

لازمی خصوصیات:

فائر انجینئرنگ کے شعبے میں کامیابی کے لیے میکانکی صلاحیت اپنے ہدف پر پہنچنے کے لیے لگن اور حوصلہ، ذہنی و جسمانی قوت کے ساتھ ساتھ اپنی تعلیم میں اخلاص کے ساتھ محنت کا جذبہ ضروری ہے۔ یہاں یہ یاد رہے کہ صرف فائر انجینئر کی ڈگری حاصل کر لینا کافی نہیں۔ کمال تو جب ہے کہ آپ ایک فائر انجینئر کی حیثیت سے عملی میدان میں بھی کامیاب ہوں۔ اس کے لیے آپ میں پوری صلاحیت کے ساتھ کام کرنے کا ہنر، آفات اور مشکلات کے وقت نبرد آزمائی کا حوصلہ؛ نازک صورت حال میں صبر و استقلال کا جذبہ؛ قائدانہ صفات، بوقت ضرورت عوام سے کام لینے کی تکنیک اور درپیش مسائل سے خوش اسلوبی سے نپٹنے کے لیے حاضر دماغی کی خصوصیات ہونی چاہئیں۔ ان کے علاوہ اصول کی پاسداری، ذمہ داری کا احساس اور ڈسپلن بھی کامیاب ہونے کے لیے لازمی عناصر ہیں۔ کسی بھی ناگہانی حالت سے نپٹنے کے لیے حفظ ماتقدم کے تحت تیاری کے ساتھ ساتھ آلات و اوزار اور اصول و ضوابط سے متعلق معلومات میں توسیع کرتے رہنا بھی ایک کامیاب فائر انجینئر کے لیے ضروری ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اپنی خدمات کے لیے ہر لحاظ سے وقف ہونا ہی کامیابی کا ضامن ہے۔

ذمہ داریاں:

فائر انجینئر کی ذمہ داریوں میں ایک یہ ہے کہ وہ مختلف تنظیموں اور اداروں کو ہنگامی حالات میں آتشزدگی سے تحفظ کے لیے تربیت، مشورہ اور تعاون دیتا ہے۔ عمارات اور آلات کی جانچ کر جوکھم والے مقامات کا پتہ لگانا اور علاقائی ادارہ و ریاستوں کے اصول و ضوابط کو نافذ کرنا بھی اس کی ذمہ داری ہے۔ آتشگیر، خطرناک اور دھماکہ خیز مادوں کو محفوظ رکھنے، آگ سے متنبہ کرنے والا نظام بنانے، اس پر قابو پانے والے آلات اور اوزار کا ڈیزائن تیار کرنے اور ان کے بارے میں سفارشات پیش کرنے کے لیے بھی یہ لوگ پابند عہد ہوتے ہیں۔ ان کاموں کے علاوہ آتشزدگی کے اسباب کا پتہ لگانا، آتشزدگی روکنے والے عوامل و محرکات کی تلاش و تجربہ کرنا اور اپنے آلات کا تحفظ ان کے معمولات ہیں۔

تربیتی کورس:

1. انجینئرنگ گریجویٹ (فائر): ساڑھے تین سال کے اس کورس میں ملک کے فائر سروس کے اہم مراکز میں آگ بجھانے کی عملی تربیت بھی شامل ہے۔ اس میں داخلے کے لیے بی.ایس.سی. (سال اول) یا کوئی مساوی امتحان علم کیمیا (Chemistry)، طبعیات (Physics) یا ریاضیات (Mathematics) مضامین کے ساتھ پاس کرنا ضروری ہے۔

الف. امیدوار کی عمر داخلے والے سال کی پہلی جولائی کو 19 سے 23 سال کے درمیان ہونی چاہیے۔ اس میں درج فہرست ذات اور درج فہرست قبائل کے امیدواروں کو عمر میں پانچ سال کی رعایت دی جاتی ہے۔

ب. جسمانی معیار: اونچائی — 165 سنٹی میٹر؛ وزن — 50 کلوگرام؛ سینہ — 81 سنٹی میٹر؛ نظر — 6/6 (بغیر چشمہ کے)

ج. انتخابی عمل: انتخاب کے لیے امیدواروں کو کل ہند داخلہ امتحان اور کالج میں انٹرویو کے عمل سے گزرنا پڑتا ہے۔ دونوں کے مشترکہ نمبر کی بنیاد پر داخلے کا موقع ملتا ہے۔ تحریری امتحان میں علم طبعیات اور علم کیمیا کے سوالات پوچھے جاتے ہیں جو معروضی نوعیت (Objective) کے ہوتے ہیں اور بی.ایس.سی. معیار کے ہوتے ہیں۔

2. سب آفیسر کورس (33 ہفتے): اس کورس میں 21 ہفتے کی ٹریننگ کالج

اور 12 ہفتے کی ٹریننگ ہندوستان کے کسی مستند فائر سروس مرکز میں ہوتی ہے۔

الف۔ اہلیت: سب آفیسر کورس کے لیے کم از کم 2+10 یا مساوی تعلیم اہلیت کے ساتھ ساتھ ہندی اور انگریزی میں پڑھنے، لکھنے، بولنے اور سمجھنے کی صلاحیت لازمی ہے۔

ب۔ عمر: اس کے لیے داخلہ والے سال کی پہلی جنوری کو امیدوار کی عمر 18 سے 23 سال کے درمیان ہونی چاہیے۔ درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبائل کو یہاں بھی عمر کی آخری حد میں پانچ سال کی رعایت دی جاتی ہے۔

ج۔ جسمانی: اونچائی —165 سنٹی میٹر (پہاڑی علاقوں کے امیدواروں کے لیے 160 سنٹی میٹر)؛ وزن —50 کلو گرام سے کم نہیں؛ سینہ —81 سنٹی میٹر (بغیر پھلائے)

د۔ انتخابی عمل: اس کورس کے لیے بھی مذکورہ کورس کی طرح کل ہند سطح کا داخلہ امتحان منعقد کیا جاتا ہے۔ جس میں معلومات عامہ ریاضی اور انگریزی کے سوالات پوچھے جاتے ہیں جو معروضی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ پوچھے جانے والے سوالوں کا معیار 2+10 کا ہوتا ہے۔

ادارہ: نیشنل فائر سروس کالج (وزارت داخلہ)، ناگپور کے ذریعہ مذکورہ بالا دونوں کورسیز کی تعلیم دی جاتی ہے۔

3. دیگر کورسیز: فائر انجینئرنگ کے لیے دسویں کلاس کے بعد چھ ماہ کا سرٹیفکیٹ کورس اور بارھویں درجے کے بعد یک سالہ کورس بھی دستیاب ہے حالانکہ یہ کورس کے کرنے کے بعد ہندوستان میں ترقی اور کامیابی کے بہت زیادہ امکانات نہیں ہیں لیکن مشرق وسطی کے ممالک میں ٹیکنکل اسسٹنٹ یا میکنکس ورکرس کی حیثیت سے ملازمت بہ آسانی مل جاتی ہے اور اچھی تنخواہ بھی ملتی ہے۔ یہ دونوں کورس درج ذیل اداروں میں بھی دستیاب ہیں۔

Indian Institute of Fire Engineering, New Delhi

Indian Institute of Fire Safety Enginnering, New Delhi

National Institute of Fire Engineering, Mumbai

روزگار کے امکانات: یوں تو میٹرک کے بعد ششماہی کورس (سرٹیفکیٹ کورس) اور بارھویں یا 2+10 کے بعد ایک سالہ کورس کر لینے کے بعد ہی روزگار کے دروازے کھل جاتے ہیں لیکن صحیح معنوں میں ہندوستان میں فائر انجینئرنگ میں گریجویشن کے بعد ہی وسیع امکانات میسر ہوتے ہیں۔ گریجویشن کے بعد پرائیوٹ سیکٹر اور پبلک سیکٹر دونوں میں آپ آفیسر یا منیجر کیڈر میں بحال ہو سکتے ہیں۔ ملک کے مختلف فائر سیفٹی مراکز میں بھی فائر انجینئر کی بحالی ہوتی ہے۔ اس کے لیے آپ کو جانکاری ہونی چاہیے۔ ہندوستان کی تقریباً ہر ریاست میں فائر کنٹرولنگ کے لیے فائر انجینئر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ انشورنس اسکیم کے شعبے میں بھی ایک فائر انجینئر ایڈوائزر کی حیثیت سے بحالی ہوتی ہے۔

□□□

Deptt. of Urdu
Bihar Legislative Council
Patna

احمقوں کی جنت

مصنف: ہنگر/مترجم: ڈاکٹر شریف احمد

''احمقوں کی جنت'' میں بچوں کے لیے 12 چھوٹی چھوٹی دلچسپ اور سبق آموز کہانیاں ہیں جنھیں پڑھتے ہوئے بچے اپنی ہنسی روک نہیں سکتے۔
ہر کہانی کے ساتھ کارٹونی تصویر بھی دی گئی ہے۔

صفحات: 24، قیمت: -/12 روپے

ربن

مصنف: سوکمار ہنگر/مترجم: کے۔ پی۔ رائے زادہ

بچوں کو اپنے کھلونے، میک اپ اور کھیل کود سے بڑی دلچسپی ہوتی ہے اور وہ ان موضوعات پر خوب مزے لے لے کر باتیں کرتے ہیں۔ انھی سامانِ تفریح میں ایک ''ربن'' ہے جو مالا کی سال گرہ پر اس کی ماں دیتی ہے۔ یہ ''ربن'' کس کس طریقے سے اس تک پہنچتی ہے کہانی میں اس کا پر تجسس بیان بچوں کو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔

صفحات: 16، قیمت: -/15 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45%اور اساتذہ کے لیے 40%کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110 066

تحریر: درگھ پال سنگھ بھنڈاری
ترجمہ: مشرف علی

جنوبی ایشیائی علاقائی تعاون کی تنظیم (سارک)

تعارف:

بین الاقوامی سیاست میں علاقائیت کا بھی ایک اہم رول ہے۔ علاقائیت پر مشتمل اسی سیاست کی بدولت کچھ ممالک باہمی صلاح و مشورے سے ایک تنظیم بنا لیتے ہیں انھیں علاقائی تنظیم اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان کا اختیار ایک خاص علاقے تک ہی محدود ہوتا ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد اکثر علاقائی تنظیموں کا قیام اسی مقصد کے تحت عمل میں آیا ہے کہ ان کے ذریعے علاقائی سطح پر معاشی، سماجی اور سلامتی سے متعلق مسائل کو حل کیا جا سکے۔ اس لحاظ سے جنوبی ایشیائی علاقائی تعاون کی تنظیم (سارک) بھی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ جنوبی ایشیائی ممالک میں تعاون اور قیادت کے لیے ایک علاقائی تنظیم کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اس ضرورت کے پیش نظر بنگلہ دیش کے سابق صدر ضیاء الرحمن نے جنوبی ایشیائی علاقائی تعاون کی تنظیم کے لیے ایک دستاویزی پس منظر تیار کر کے جنوبی ایشیائی ممالک کے سربراہوں کو پیش کیا۔ اس کے بعد 1981 سے 1985 کے درمیان جنوبی ایشیائی ممالک کے خارجہ سکریٹریوں کا اجلاس کولمبو، کٹھمنڈو، اسلام آباد، نئی دہلی اور مالدیپ میں منعقد کیا گیا۔ آخرکار 1985 میں مالدیپ کے دارالسلطنت 'مالے' میں جنوبی ایشیا کے سات ممالک کی کانفرنس ہوئی اور اس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ جنوبی ایشیائی علاقائی تعاون کی تنظیم (سارک) کی پہلی چوٹی کانفرنس بنگلہ دیش کے دارالسلطنت ڈھاکہ میں منعقد ہوگی۔

جنوبی ایشیائی ممالک کے درمیان علاقائی تعاون کے فروغ کے مقصد سے ڈھاکہ میں بھارت، پاکستان، نیپال، بھوٹان، بنگلہ دیش، سری لنکا اور مالدیپ کے سربراہوں کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی اور اس کانفرنس میں جنوبی ایشیائی علاقائی تعاون کی تنظیم (سارک) کا قیام عمل میں آیا اور اس کا صدر دفتر کٹھمنڈو (نیپال) میں قائم کیا گیا۔ اس تنظیم (سارک) کے قیام میں کسی بھی سپر پاور کا رول نہیں رہا ہے اور تنظیم محض سات ممالک کی معاشی ضرورتوں اور باہمی روابط کے پیش نظر وجود میں آئی، اور اس میں ایک ایسے نظام کو تشکیل دیا گیا، جو باہمی احترام، مساوات اور مشترکہ مفاد پر مبنی ہے۔ اس کا بنیادی مقصد ممبر ممالک کے مشترکہ تعاون سے جنوبی ایشیائی خطے میں سماجی اور معاشی ترقی کی رفتار کو مزید بڑھانا ہے۔ سارک کے چارٹر کے مطابق شق۔2 میں بطور خاص مندرجۂ ذیل تین اصول شامل ہیں۔

1. تنظیم کے ڈھانچے کی تشکیل کے لیے تعاون، مساوات، وفاقی یکجہتی، علاقائی سلامتی، سیاسی آزادی، عدم مداخلت اور باہمی مفاد کے اصولوں کا احترام کرنا اور بین الاقوامی معاملات میں عدم مداخلت کو بنیاد بنا کر تنظیم کا ڈھانچہ تشکیل دینا۔
2. یہ تنظیم دو طرفہ تعاون اور کثیر الاطراف ذمہ داریوں کی مخالفت نہیں کرے گی۔
3. اور یہ تعاون دوطرفہ یا کثیر الاطراف تعاون کے عوض میں نہیں ہوگا۔

اس تنظیم کے خاص مقاصد کا ذکر اس کے چارٹر کے شق۔1 میں شامل ہے جو مندرجہ ذیل ہیں:

1. اس تنظیم کے ذریعے جنوبی ایشیائی ممالک کے عوام کی فلاح و بہبود کو فروغ دینا اور ان کے رہن سہن کے معیار کو بہتر بنانا۔
2. بین الاقوامی فورم میں عام مقاصد کے حصول کے لیے آپسی تعاون کو مضبوط کرنا اور خطے میں معاشی، سماجی یا ثقافتی ترقی کی رفتار کو تیز کرنا اور دیگر ترقی پذیر ممالک کے ساتھ تعاون کو فروغ دینا۔
3. بین الاقوامی موضوعات پر عام مفاد کے لیے تعاون کو بہتر بنانا اور جنوبی ایشیائی ممالک کی اجتماعی خود انحصاری کو فروغ دینا۔
4. باہمی اعتماد کی بحالی، سوجھ بوجھ کو فروغ دینا اور ایک دوسرے کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرنا۔
5. معاشی، سماجی، ثقافتی، تکنیکی اور سائنسی شعبے میں فوراً تعاون اور باہمی امداد کو فروغ دینا۔

اس تنظیم کو آپسی مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ سارک یعنی جنوبی ایشیائی ممالک میں نظام حکومت کا ڈھانچہ مختلف ہے۔ پاکستان میں فوجی آمریت ہے تو ہندوستان، سری لنکا اور مالدیپ میں جمہوری نظام حکومت ہے جب کہ نیپال اور بھوٹان میں شاہی نظام حکومت ہے۔ سارک کے ممبر ممالک میں رہنے والے مختلف مذاہب کے پیروکاروں کی وجہ سے بھی سماجی ماحول

کشیدہ رہتا ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ اس تنظیم میں ہندوستان آبادی اور رقبے کے لحاظ سے سب سے بڑا ملک ہے جس کی وجہ سے دوسرے ممبر ممالک اسے شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور تنظیم کی راہ میں یہ سب سے بڑی مشکل ہے۔ سارک ممبر ممالک کے باہمی تنازعے اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا حل چوٹی کانفرنسوں میں تلاش کرنا مشکل ہے۔ اسی حوالے سے سارک کے ممبر ملک بنگلہ دیش کی وزیر اعظم بیگم خالدہ ضیا نے ایک مرتبہ تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''جنوب ایک ایسا کٹورا ہے جس میں دال، چاول اور مچھلی کے علاوہ لال شربت بھی ہے۔''

7دسمبر 1985 کو ڈھاکہ میں پہلی چوٹی کانفرنس میں سات ممبر ممالک ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، بھوٹان، نیپال، سری لنکا اور مالدیپ کے ذریعے سارک کا قیام عمل میں آیا۔ لیکن جب سارک کی تیرھویں چوٹی کانفرنس 2005 میں 13-14 نومبر کو ڈھاکہ میں منعقد ہوئی تو اس میں افغانستان کو سارک کے آٹھویں رکن کی حیثیت دی گئی۔ اس طرح ان ممبر ممالک کی تعداد میں ایک کا اضافہ ہوگیا۔

سارک کی اب تک 13 چوٹی کانفرنسیں منعقد کی جا چکی ہیں جو بالترتیب مندرجہ ذیل ہیں:

پہلی سارک چوٹی کانفرنس 8-7 دسمبر 1985 منعقدہ ڈھاکہ

اس کانفرنس میں سارک کے سبھی ممبر ممالک نے تعاون کے شعبے میں فروغ کے لیے اپنی رضامندی ظاہر کی۔ اس کانفرنس میں سری لنکا کے سابق صدر جے۔آر۔ جے وردھنے نے ہندوستان کو سارک کا بنیادی ستون قرار دیتے ہوئے کہا تھا کہ ''ہندوستان جو سارک کے دیگر تمام ممبر ممالک سے ہر لحاظ سے بڑا ہے، عملی طور پر ہم سب میں اعتماد پیدا کرسکتا ہے کیونکہ اعتماد کی بحالی ہی تعاون کے فروغ کے لیے ضروری ہے جو کہ ترقی کے آغاز کی پہلی سیڑھی ہے۔''

دوسری سارک چوٹی کانفرنس 17-16 نومبر 1986 منعقدہ بنگلور

اس دوسری چوٹی کانفرنس میں ہندوستان کے سابق وزیر اعظم جناب راجیو گاندھی نے اس تنظیم کے صدر کا عہدہ سنبھالا۔ اس سے قبل یہ عہدہ بنگلہ دیش کے سابق صدر حسین محمد ارشاد کے پاس تھا۔ اس کانفرنس میں جہاں ایک طرف نشیلی دواؤں پر روک، بچوں کے لیے فلاحی منصوبے، نقل وحمل کے لیے علاقائی کرنسی کا نظام اور ویزا کے نظام میں رعایت دینے کا فیصلہ کیا گیا وہیں دوسری طرف نیوکلیائی اسلحے کے حصول کی دوڑ ختم کرنے، دہشت گردی کے خاتمے اور نئے معاشی نظام پر تفصیلی تبادلۂ خیال کیا گیا۔

تیسری سارک چوٹی کانفرنس 2-4 نومبر 1987 منعقدہ کٹھمنڈو

اس کانفرنس کی صدارت نیپال نریش راجا وکرم شاہ نے کی۔ اس کانفرنس میں علاقائی دہشت گردی کو روکنے اور جنوبی ایشیائی تحفظ برائے خوراک بنانے پر عام رائے قائم کی گئی۔ اس کے علاوہ اس کانفرنس میں ماحولیاتی تحفظ کے لیے علاقائی تعاون کے مواقع تلاش کرنے اور اسے عمل میں لانے کے لیے ایک اسٹڈی ٹیم (Study Team) بھی تشکیل دی گئی۔

چوتھی سارک چوٹی کانفرنس 31-29 دسمبر 1988 منعقدہ اسلام آباد

اس کانفرنس کی صدارت سابق پاکستانی وزیر اعظم بے نظیر بھٹو نے کی۔ اس کانفرنس کی خاص بات یہ تھی کہ ہندوستان اور پاکستان کے مابین سلامتی کے تعلق سے نیوکلیائی اسلحے کے ذریعے حملہ نہ کرنے اور ثقافتی رشتوں کے حوالے سے تین معاہدے ہوئے۔ اس کے علاوہ اس کانفرنس میں 2000 تک سبھی شہریوں کے لیے بنیادی ضرورتوں یعنی خورد ونوش کی اشیا، کپڑا، تعلیم، صحت اور رہائش فراہم کرنے کا فیصلہ بھی کیا گیا۔

پانچویں سارک چوٹی کانفرنس 23-21 نومبر 1990 منعقدہ مالے

اس کانفرنس کی صدارت مالدیپ کے سابق صدر مامون عبدالقیوم نے کی تھی۔ اس کانفرنس میں 1991 کو سارک کے رہائشی سال، 1992 کو سارک کے ماحولیاتی سال اور 1993 کو سارک کے معذوروں کے سال کے طور پر منانے کے لیے متفقہ فیصلہ کیا گیا۔ کانفرنس میں نشیلی اور نشہ آور اشیا کی اسمگلنگ روکنے، بنیادی معاشی شعبے میں تعاون شروع کرنے اور تنظیم کی سرگرمیوں کی ذرائع ابلاغ کے ذریعے ترسیل اور ماحولیاتی شعبے کو فروغ دینے کے لیے بھی سبھی ممبر ممالک رضامند ہوئے۔ سارک کی اس چوٹی کانفرنس میں کٹھمنڈو میں تپ دق کی روک تھام کا مرکز اسلام آباد میں انسانی وسائل کے فروغ کا مرکز اور نئی دہلی میں علاقائی دستاویزی مرکز کھولنے کا فیصلہ کیا گیا۔

چھٹی سارک چوٹی کانفرنس، 21 دسمبر 1991 منعقدہ کولمبو

اس کانفرنس میں ہندوستان کے سابق وزیر اعظم جناب نرسمہا راؤ اور بھوٹان نریش جگمے وانگ چک حصہ نہیں لے سکے۔ یہ کانفرنس ایک روز چلی جس میں نشہ آور اشیا اور دہشت گردی کے خلاف اجتماعی کارروائی، خطے میں غریبی دور کرنے کی کوشش اور اجتماعی معاشی تحفظاتی نظام کے قیام پر تبادلۂ خیال کیا گیا۔

ساتویں سارک چوٹی کانفرنس: 11-10 اپریل 1993 منعقدہ ڈھاکہ

اس کانفرنس کی صدارت محترمہ خالدہ ضیا نے کی۔ اس کانفرنس کی خاص بات یہ تھی کہ سارک کے ممبر ممالک نے جنوبی ایشیا میں معاشی تعاون کے فروغ کے لیے ایک بڑا تجارتی بازار بنانے کا فیصلہ کیا اور اس مقصد کے لیے ''جنوبی ایشیائی ترجیحی تجارتی معاہدہ (South Asian Preferential Trade Agreemtn, SAPTA) پر دستخط کیا۔ تاہم ہندوستان کے سابق وزیر اعظم نرسمہا راؤ جو اس کانفرنس میں ہندوستان کی نمائندگی کر رہے تھے، انھوں نے سارک کے تئیں تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ سارک کے ممبر ممالک کے مابین تعاون اس حد تک ان شعبوں میں نہیں ہو پا رہا ہے جن مقاصد کے تحت سارک کا قیام عمل میں آیا ہے۔

آٹھویں سارک چوٹی کانفرنس: 4-2 مئی 1995 منعقدہ دہلی

اس کانفرنس کی صدارت سابق ہندوستانی وزیر اعظم جناب نرسمہا راؤ نے کی۔ اس کانفرنس میں علاقائی تعاون، ماحولیات، افلاس کے خاتمے کی تدابیر، معاشی وسماجی مسائل اور ناخواندگی وغیرہ پر تبادلۂ خیال کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ سارک کے ممبر ممالک نے جنوبی ایشیائی آزاد تجارتی خطہ (South Asian Free Trade Area) شروع کرنے کا بھی فیصلہ کیا۔

نویں سارک چوٹی کانفرنس 14-12 مئی 1997 منعقدہ مالے

اس کانفرنس میں جہاں ایک طرف ہندوستان کے سابق وزیر اعظم اندر کمار گجرال نے جنوبی ایشیائی معاشی گروپ بنانے پر زور دیا وہیں دوسری جانب سری لنکا کی سابق صدر چندریکا کمارتنگا نے ہندوستان کو اس تنظیم کا سب سے بڑا ملک بتاتے ہوئے کہا تھا کہ ہندوستان کو دیگر ممبر ممالک میں اعتماد پیدا کرنے کے لیے پیش رفت کرنی چاہیے۔ مالدیپ کے صدر مامون عبدالقیوم نے سیاسی تعاون اور مستقل مزاجی کے معیار پر مبنی سارک کا اعلامیہ بنانے کی اپیل کی۔ اس کانفرنس میں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں توسیع کا مطالبہ کیا گیا اور نیوکلیائی (جوہری) اسلحوں کو کم کرنے کے لیے عدم اسلحہ سازی، علاقائی معاشی تعاون کے لیے سارک ممبر ممالک کے ذریعے ایک دوسرے کو تجارتی ترجیح دینے، غریبی ختم کرنے اور آپسی تعاون کے فروغ پر زور دیا گیا۔

دسویں سارک چوٹی کانفرنس 31-29 جولائی 1998 منعقدہ کولمبو

اس کانفرنس میں چھ ممالک کے سربراہان نے حصہ لیا۔ بھوٹان کے نریش اس کانفرنس میں شریک نہیں ہو سکے۔ اس کانفرنس میں ہندوستان اور پاکستان کا نیوکلیائی مسئلہ حاوی رہا۔ اس مسئلے پر کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے سابق ہندوستانی وزیر اعظم جناب اٹل بہاری واجپئی نے کہا کہ سارک کے ممبر ممالک کو نیوکلیائی آزمائشی عمل سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ لیکن اگر دیکھا جائے تو اس کانفرنس میں بطور خاص اقتصادی مسائل پر ہی زیادہ توجہ مرکوز رہی۔ (CTBT) اور Non-Proliferation Treaty (NPT) Comprehensive Test Ban Treaty کے مسئلے پر سارک کے ممبر ممالک نے اپنے اختلاف کا اظہار کیا۔

گیارھویں سارک چوٹی کانفرنس 6-4 جنوری، 2002 منعقدہ کٹھمنڈو

اس کانفرنس میں خاص طور سے دہشت گردی کا مسئلہ حاوی رہا جو کہ جنوبی ایشیائی ممالک کے لیے ایک سنگین مسئلہ ہے۔ ہندوستان کی صحیح پالیسی اور سیاسی کوششوں کے نتیجے میں سارک کے ممبر ممالک نے دہشت گردی کا مقابلہ کرنے کا عہد کیا اور 11 صفحات پر مشتمل 56 نکاتی اعلامیے پر سارک کے تمام ممبر ممالک کے سربراہوں نے 6 جنوری 2002 کو دستخط کیے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس اعلامیے میں دہشت گردی کا خاتمہ کرنے کے لیے بھی سارک کے ممبر ممالک نے ہندوستانی خیالات کی بھرپور تائید کی۔

بارھویں سارک چوٹی کانفرنس 6-4 جنوری، 2004 منعقدہ اسلام آباد

اس کانفرنس میں ہندوستان کے سابق وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی، بنگلہ دیش کی وزیر اعظم بیگم خالدہ ضیا، نیپال کے وزیر اعظم سوریہ بہادر تھاپا، سری لنکا کی سابق صدر چندریکا کمارتنگا، بھوٹان کے وزیر اعظم جگمے تھنلے اور مالدیپ کے صدر مامون عبدالقیوم اور پاکستان کے سابق وزیر اعظم ظفر اللہ خاں جمالی نے حصہ لیا۔ کانفرنس کے افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے اٹل بہاری واجپئی نے سارک کے ممبر ممالک میں افلاس کے خاتمے کے پروگرام کو آگے بڑھانے کے لیے مفلسی کے خاتمے کے لیے فنڈ اور سارک کے ممبر ممالک کے درمیان ریل، سڑک، ہوائی اور سمندری راستے کے نظام کو مضبوط کرنے کے لیے ورک فورس کے قیام کی تجویز پیش کرنے کے ساتھ یہ بھی کہا کہ ہندوستان سارک کے ممبر ممالک کے ساتھ انفارمیشن ٹیکنالوجی (IT)، حیاتیاتی تکنیک (Bio-Technique) اور سائنس کے شعبے میں اپنے تجربات بانٹنے کو تیار ہے۔ نتیجتاً کانفرنس کے اختتام پر ساتوں ممبر ممالک کے ذریعے اسلام آباد اعلامیہ جاری کیا گیا جس میں اس خطے میں افلاس اور بیماریوں کا خاتمہ کرنے کا عہد کیا گیا۔ جنوبی ایشیا میں دہشت گردی پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے اعلامیے میں یہ صاف طور پر اقرار کیا گیا کہ کسی بھی طرح کی دہشت گردی کو کسی بھی طریقے سے جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اقوام متحدہ اور سارک چارٹر کے ممبر کی حیثیت سے سبھی ممبر ممالک نے بین الاقوامی معاہدے کو نافذ کرنے کے عزم کو دہرایا۔

تیرھویں سارک چوٹی کانفرنس 13-12 نومبر 2005 منعقدہ ڈھاکہ

اس کانفرنس میں دہشت گردی کا مسئلہ ہی خاص طور پر حاوی رہا کیونکہ کانفرنس میں ہندستانی وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ نے بھی دہشت گردی کو علاقائی معاشی ترقی کے لیے زبردست خطرہ بتاتے ہوئے کہا کہ دہشت گردی کی وجہ سے پیدا ہوئے غیر سلامتی کے ماحول میں پورے خطے کی معاشی ترقی کو نقصان پہنچ رہا ہے اس لیے سبھی ممبر ممالک کو اجتماعی طور پر اس کے خاتمے کے لیے قدم اٹھانا چاہیے اور اس مقصد کے لیے ممبر ممالک کے صنعت کاروں کو بھی اہم کردار ادا کرنا ہوگا کیونکہ علاقائی غیر سلامتی کا ماحول ان کے مفاد کے لیے نقصان دہ ہے۔ کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر منموہن سنگھ نے پاکستان کا نام لیے بغیر کہا کہ ارضی نظام میں دہشت گردی کی وجہ سے صرف ہندوستان یا کسی ایک ملک کی ترقی میں رکاوٹ پیدا نہیں ہوگی بلکہ اس کا خمیازہ سارک کے تمام ممبر ممالک کو بھگتنا ہوگا۔ اس لیے دہشت گردی کے خاتمے کی ذمہ داری اجتماعی طور پر لینی ہوگی کیونکہ اگر ایک ملک دہشت گردی کے چنگل میں آجاتا ہے تو ہمسایہ ممالک بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ یہی نہیں ڈاکٹر منموہن سنگھ نے سارک ممبر ممالک کے درمیان امن قائم کرنے اور تجارتی رشتے کے فروغ کے لیے عام لوگوں کے درمیان رابطہ بڑھانے پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اس سے علاقائی حصہ داری اور خوشحالی کے دروازے کھل سکتے ہیں۔ جنوبی ایشیائی آزاد تجارتی خطے (SAFTA) کے بارے میں منموہن سنگھ نے کہا کہ اگر سارک ممبر ممالک کے درمیان آزاد تجارتی نظام قائم ہو جائے تو دو سال کے اندر ہی اس خطے کی کل تجارت 6 ارب ڈالر سے بڑھ کر 14 ارب ڈالر کی سطح تک پہنچ جائے گی۔ جس کے بعد جنوبی ایشیائی معاشی تنظیم کی تکمیل کا خواب آسان ہو جائے گا۔ سارک کی اگلی چوٹی کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے ڈاکٹر منموہن سنگھ نے پاکستان، نیپال، بھوٹان، بنگلہ دیش، سری لنکا اور مالدیپ کے سربراہوں سے کہا کہ وہ جنوبی ایشیائی آزاد تجارتی خطے (SAFTA) کے باہمی مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوشش کریں تاکہ اسے یکم جنوری، 2006 سے نافذ کیا جاسکے۔

کشمیر مسئلے کا ذکر کرتے ہوئے پاکستانی وزیر اعظم شوکت عزیز نے کہا کہ اگر کشمیر میں فوجیں کم کی جائیں تو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جہاں عدم اعتماد کی خلیج کم ہوگی وہیں باہمی تعاون اور اعتماد میں اضافہ ہوگا۔ انھوں نے مزید کہا کہ دونوں ممالک کے درمیان امن مذاکرات میں پیش رفت ہو رہی ہے تاہم کشمیر کا اہم مسئلہ ہنوز برقرار ہے جب کہ ڈاکٹر منموہن سنگھ نے کہا کہ پاکستان سرحد پار دہشت گردی اور دراندازی پر روک لگائے اور سرحد پر فوجیں کم کرے۔ جواب میں پاکستانی وزیر اعظم شوکت عزیز نے کہا کہ اگر میل ملاپ کا ماحول بنانا ہے تو دونوں ممالک کو اپنی اپنی فوجوں میں کمی کرنی ہوگی۔ یہی نہیں پاکستانی وزیر اعظم کا یہ بھی کہنا تھا کہ اگر ہندوستان اور پاکستان باہمی مسائل کا حل تلاش کر لیتے ہیں تو اس سے باہمی ماحول بہتر ہوگا۔ وزیر اعظم شوکت عزیز نے خطے میں مستقل امن کو کشمیر مسئلے کے دیرینہ حل سے جوڑتے ہوئے کہا کہ کشمیر مسئلے پر پیش رفت سے دونوں ممالک کے درمیان طویل مدتی رشتوں میں بہتری آئے گی۔ دونوں ہمسایہ ممالک کے درمیان مسئلۂ کشمیر، تجارت، فوجوں میں کمی اور خود حکمرانی (Self Governance) کے بشمول مختلف مسائل پر گفتگو ہوئی۔

آخر میں آٹھ صفحات پر مشتمل ایک اعلامیہ جاری کیا گیا جس میں ممبر ممالک کے ذریعے خطے میں معاشی ترقی کی رفتار تیز کرنے، سماجی ترقی کے لیے آپسی تعاون پر رضامندی، دہرے ٹیکس کا نظام ختم کرنے، ویزا کے معاملات میں رواداری اور سارک پنچایت کونسل کے قیام سے متعلق مختلف معاہدوں پر دستخط کیے گئے۔

کانفرنس کے اختتام پر ڈاکٹر منموہن سنگھ نے جہاں افغانستان کو سارک کا آٹھواں ممبر بنانے کا اعلان کیا تو وہیں دوسری طرف ڈھاکہ چوٹی کانفرنس کی میزبان اور بنگلہ دیش کی وزیر اعظم بیگم خالدہ ضیا نے اس امر کا اعلان کیا کہ چودھویں چوٹی کانفرنس جنوری 2007 میں ہندوستان میں منعقد ہوگی۔

اس کانفرنس میں اگر کچھ خاص تھا تو وہ افغانستان کو سارک کا آٹھواں ممبر بنایا جانا تھا۔ علاوہ ازیں اس کانفرنس میں ممبر ممالک کے ذریعے یکم جنوری 2006 سے آزاد تجارت شروع کرنے کے لیے رضامندی ظاہر کی گئی ہے۔

مختصراً یہ کہ سارک سات ممالک کا گروپ ہے لیکن اس میں کوئی مشترکہ سلامتی کا مسئلہ نہیں ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب بنگلہ دیش کے سابق صدر ضیاء الرحمن نے سارک کی تجویز پیش کی تھی تو انھیں اس حقیقت کا احساس تھا کہ جنوبی ایشیا کے سات ممالک سلامتی کے مسئلے کی بنیاد پر ایک پلیٹ فارم پر نہیں آسکتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے یہ دلیل پیش کی تھی کہ جنوبی ایشیائی ممالک کو ایک دوسرے کے درمیان معاشی، تجارتی اور تکنیکی تعاون کے فروغ کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ لیکن سارک کے قیام کے 20 برسوں کے بعد بھی یہ ممکن نہیں ہو سکا ہے۔ اس کی اہم وجہ آپسی ناچاقی ہے۔ ایسے میں ان مقاصد کی تکمیل کیسے ممکن ہے جن مقاصد کے تحت سارک کا قیام عمل میں آیا تھا۔

بشکریہ ہندی ماہنامہ ''پرتیوگتا درپن''، آگرہ

□□□

مترجم کا پتہ:
1070, Sector-5, R.K. Puram
New Delhi-110022

اردو خبرنامہ

مذاکرہ ''معاصر ادب کے سروکار''

● نئی دہلی، 22 اپریل۔ ایوانِ غالب میں ''معاصر ادب کے سروکار'' کے عنوان سے ایک مذاکرہ منعقد کیا گیا جس کے کنوینر ممتاز ناقد اور کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کے صدر پروفیسر قمر رئیس تھے۔ اس میں مقامی ادیبوں اور دانشوروں کے علاوہ پروفیسر سید محمد عقیل، پروفیسر علی احمد فاطمی، عابد سہیل، غضنفر، ثروت خاں اور رتن سنگھ نے بطور خاص شرکت کی۔ اس موقعے پر پروفیسر قمر رئیس نے ہندوستان کی ادبی صورت حال پر اظہار تشویش کرتے ہوئے کہا کہ ''اردو کے عصری ادب میں کساد بازاری کے جو نشانات نظر آتے ہیں اگر انحطاط نہیں تو جمود و تعطل کا جو احساس ہوتا ہے اس کے کچھ اسباب ضرور ہوں گے۔ کیا وجہ ہے کہ ادب کے سنجیدہ قارئین اور قدر شناسوں کی تعداد گھٹتی جا رہی ہے؟ کیوں ہم سنجیدہ ادبی انہاک سے دور ہوتے جا رہے ہیں؟''

ان سوالوں کے درمیان سیمینار کے پہلے اجلاس کا آغاز ہوا جس کا تعلق معاصر افسانوی ادب سے تھا۔ مجلس صدارت میں جوگندر پال، رتن سنگھ، عابد سہیل اور سبط اختر تھے۔ نظامت علی احمد فاطمی نے کی۔ عبد الصمد کا مقالہ ''اردو کہانی مر نہیں سکتی'' علی احمد فاطمی نے پیش کیا۔ ڈاکٹر انور پاشا نے ''ہم عصر اردو ناول'' پر مقالہ پیش کیا۔ جلسے میں ڈاکٹر شہزاد انجم، ڈاکٹر ثروت خاں اور ڈاکٹر نگار عظیم نے بھی مقالے پیش کیے۔ پروفیسر سید محمد عقیل، ڈاکٹر غضنفر علی، انجم عثمانی، پیغام آفاقی، علی احمد فاطمی اور مولا بخش اسیر نے بحث و مباحثے میں حصہ لیا۔

جوگندر پال نے صدارتی خطبے میں کہا کہ ادب میں حقیقت بالذات نہیں ہوتی۔ ایک تخلیقی سیاق پیدا کرنا ہوتا ہے اور سیاق بدلتا بھی رہتا ہے۔ جو کام ہم سے نہیں ہو سکا وہ یہ نوجوان کر رہے ہیں۔ تنقید نگاروں کو چاہیے کہ وہ تخلیق میں شامل ہو کر پڑھیں اور سمجھیں۔ رتن سنگھ نے کہا کہ اچھا لکھنے کے لیے اچھا پڑھنا بہت ضروری ہے۔ ہم لوگ اپنے عہد میں اپنے بزرگوں کی کہانیاں تبرک کے طور پر پڑھتے تھے۔ عابد سہیل نے کہا کہ اگر ہمیں آج قاری کی کمی کی شکایت ہے تو یہ بھی سوچنا چاہیے کہ کیا ہم نے ایسا لکھا کہ قاری پڑھنے پر مجبور ہو جائے۔

شاعری پر مبنی دوسرے اجلاس کی مجلس صدارت میں پروفیسر سید محمد عقیل، ڈاکٹر کمال احمد صدیقی اور پروفیسر عتیق اللہ تھے۔ اس میں ڈاکٹر محمد کاظم، ڈاکٹر مولا بخش، پروفیسر عتیق اللہ نے مقالے پیش کیے۔ ان مقالات پر پیغام آفاقی، عظیم صدیقی، غضنفر، مولا بخش، علی احمد فاطمی، شہزاد انجم وغیرہ نے گفتگو کی۔ صدر جلسہ سید محمد عقیل نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ جس طرح زمانہ تیزی سے بدل رہا ہے، پرانی شاعری کا مزاج باقی نہ رہے گا اور غزل نظم کے بجائے نثری نظم کا رواج بڑھے گا۔ اس جلسے کی نظامت ڈاکٹر نگار عظیم نے کی۔ آخر میں انجمن کے جنرل سکریٹری علی احمد فاطمی نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

(ڈاک سے)

فخر الدین علی احمد صد سالہ تقریبات

● نئی دہلی۔ 13 اور 14 مئی کو سابق صدر جمہوریہ ہند مرحوم فخر الدین علی احمد کی یاد میں صد سالہ تقریبات کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر ''ہندوستان کی مشترکہ تہذیب'' کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے معروف مورخ پروفیسر بپن چندرا نے کہا کہ ہمارا ملک جس میں مختلف تہذیب و ثقافت کے لوگ رہتے ہیں اس کے مشترکہ کلچر کا خواب اس وقت شرمندۂ تعبیر ہوگا جب ہم ہر مذہب، ہر تہذیب اور ہر زبان کا احترام کریں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو زبان ہماری مشترکہ تہذیب کی سب سے بڑی علامت ہے مگر 1947 کے بعد اسے جتنی ترقی کرنی چاہیے تھی اتنی ترقی نہ کر سکی۔ پروفیسر چندرا نے کہا کہ فخر الدین علی احمد ہماری مشترکہ تہذیب کی بڑی علامت تھے۔ اس موقعے پر مرکزی وزیر کپل سبل نے کہا کہ آج ہم ایک ایسے دور سے گزر رہے ہیں جس میں چند عناصر اس ملک کی ملی جلی تہذیب کو ختم کرنے پر آمادہ ہیں۔ اس سے قبل غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر شاہد ماہلی نے سیمینار کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ فخر الدین علی احمد نے اپنی پوری زندگی ملک کی خدمت اور کمزوروں کی مدد کرنے میں صرف کر دی اور وہ اس ملک کی گنگا جمنی اور مشترکہ تہذیب کی سب سے بڑی مثال تھے۔

سکریٹری غالب انسٹی ٹیوٹ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اپنی استقبالیہ تقریر میں کہا کہ فخر الدین علی احمد نے ساری زندگی ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی تعمیر کی کوششوں میں گزاری۔

اپنے صدارتی خطبے میں جناب محمد شفیع قریشی (سابق گورنر مدھیہ پردیش، بہار) نے کہا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم صرف زبان سے مشترکہ تہذیب کی بات نہ کریں بلکہ اسے عمل میں لانے کی کوشش کریں۔ انھوں نے کہا کہ ہماری ملی جلی تہذیب ہندوستان کی عظمت کا نشان ہے مگر افسوس کہ چند طاقتیں ایسی ہیں جو اس مشترکہ کلچر کو ختم کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ افتتاحی تقریب میں جسٹس بدر دُرریز احمد، بیگم صبا احمد، خواجہ حسن ثانی نظامی، پروفیسر

شمیم حنفی، پروفیسر شریف حسین قاسمی، بلراج ورما، مظہر امام، پروفیسر سید امیر حسن عابدی کے علاوہ بڑی تعداد میں سامعین موجود تھے۔ سیمینار کے دوسرے دن 14 مئی کو تین اجلاس ہوئے جن میں پروفیسر شریف حسین قاسمی، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر ظہیر الدین ملک، ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر اقتدار حسین صدیقی، پروفیسر علی احمد فاطمی، ڈاکٹر عابد رضا بیدار، ڈاکٹر مظہر مہدی، ڈاکٹر رضا حیدر اور احمد طارق نے مقالے پیش کیے۔ ان تمام اجلاسوں میں صدارتی فریضے ڈاکٹر کمال احمد صدیقی، ڈاکٹر عابد رضا بیدار اور پروفیسر قمر رئیس نے انجام دیے، نظامت ڈاکٹر رضا حیدر، ڈاکٹر اشفاق عارفی، ڈاکٹر شعیب رضا اور ڈاکٹر مغنی رضوی نے کی۔

(ڈاک سے)

اردو اکادمی دہلی کی سلور جبلی

● نئی دہلی، 20 مئی۔ اردو اکادمی دہلی کی سلور جبلی تقریبات کے افتتاح کے موقعے پر یادگاری مجلے کا اجرا کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ شیلا دکشت نے کہا کہ اردو صرف زبان ہی نہیں بلکہ ایک تہذیب ہے، ہمارا مقصد اردو کو سب کی زبان بنانا ہے۔ اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے دینا ہی کافی نہیں ہے۔ اس تقریب کی صدارت م۔ افضل نے کی جبکہ مہمان خصوصی کے طور پر وزیر ٹرانسپورٹ ہارون یوسف نے شرکت کی۔ مہمانان ذی وقار میں اردو اکادمی کے سابق وائس چیئرمین کلا نند بھارتی، پروفیسر گوپی چند نارنگ، اشتیاق عابدی اور الطاف احمد اعظمی کے علاوہ اکادمی کے بانی سکریٹری شریف الحسن نقوی شامل تھے۔ ان کے علاوہ سابق سکریٹری منصور احمد عثمانی، مخمور سعیدی اور عظیم اختر بھی موجود تھے۔ اکادمی کے سکریٹری مرغوب حیدر عابدی نے خیر مقدمی کلمات پیش کیے جب کہ نظامت انیس اعظمی نے کی۔ اس سے قبل معروف غزل سرا پیناز مسانی نے اپنی غزلوں سے سامعین کو محظوظ کیا اور ترشنا گروپ کی جانب سے سدھانشو بہوگنا اور ان کے ساتھیوں نے علی سردار جعفری کا ترانۂ اردو پیش کیا۔ اس موقعے پر ہارون یوسف نے کہا کہ دہلی اردو اکادمی ملک کی سب سے فعال اکادمی ہے جس کی کارگزاریوں کا ذکر بیرونی ممالک میں بھی ہوتا ہے۔ ساہتیہ اکادمی کے صدر پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ اسکولوں میں اردو کی تعلیم کے انتظام کو بھی بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔ آج صورت حال یہ ہے کہ دہلی میونسپل کارپوریشن، این ڈی ایم سی اور دہلی حکومت کے اسکولوں میں بھی اردو اساتذہ کی متعدد اسامیاں خالی پڑی ہیں۔ ان پر اردو اساتذہ کی فوری طور پر تقرری کی جانی چاہیے۔

اس موقعے پر اردو اکادمی، دہلی سے وابستگی اور اردو زبان و ادب کی خدمات کے اعتراف میں جن دانشوروں، ادیبوں، شاعروں، نقادوں اور اساتذہ کو سلور جوبلی اعزازات سے نوازا گیا ان میں پروفیسر محمد حسن، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر شارب ردولوی، پروفیسر عبدالحق، پروفیسر ظفر احمد نظامی، پروفیسر شمیم نکہت، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر صغرا مہدی، جناب مخمور سعیدی، پروفیسر محمد شاہد حسین، جناب رفعت سروش، جناب بلراج کومل، ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، ڈاکٹر خالد محمود، جناب ابوظہیر ربانی، محترمہ نگار عظیم وغیرہ کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

("قومی آواز" دہلی)

"تہذیب شناسی کے بنیادی اصول" توسیعی خطبہ

● میرٹھ، 30 مئی۔ اردو تہذیبی و ثقافتی قدروں کی ترجمان اور ایک بڑی ادبی زبان ہے۔ ان خیالات کا اظہار شعبۂ اردو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کی جانب سے قومی یکجہتی سیریز کے اولین توسیعی خطبے میں معروف دانشور مولانا عقیل الغروی نے کہا۔ انھوں نے "تہذیب شناسی کے بنیادی اصول" کے موضوع پر خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اقدار انسانی کی ترجمان غزل سے مراثی تک بیشتر اصناف شعر میں اور مختصر افسانوں سے طویل داستانوں، انشائیوں، خطوط، تنقیدی مضامین یہاں تک کہ طنزیہ ادب اور فکاہیہ کالموں تک، رانی کیتکی اور بکٹ کہانی سے "آب گم" تک شیر و شکر کی طرح ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر مشترکہ تہذیب کی شناخت کی جانی چاہیے۔ انھوں نے عربی، فارسی اور ہندی کا حوالہ پیش کرتے ہوئے تہذیبی شناخت کے بنیادی اصول پر گفتگو کی۔ صدر جلسہ میرٹھ کالج کے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر خالد حسین خاں تھے۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری صدر شعبہ نے تعارفی کلمات پیش کیے۔ جلسے میں مفتی غازی ولی احمد ولی چشتی نے بھی خطاب کیا۔ پروگرام کا افتتاح میرٹھ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ایس کے اگروال اور پروفیسر جے۔ کے۔ پنڈیر نے مشترکہ طور پر شمع روشن کر کے کیا۔ شعبے کے استاد ڈاکٹر مشتاق صدف نے مولانا عقیل الغروی کا تعارف پیش کیا۔ اس جلسے کی نظامت عابد علی کامل نے کی۔

("راشٹریہ سہارا" دہلی)

دہلی کے اردو میڈیم اسکولوں کے نتائج

● نئی دہلی، 23 مئی۔ سی. بی. ایس. ای. کے تحت ہوئے بارھویں جماعت کے امتحان کے نتائج کا اعلان ہو گیا ہے۔ بستی حضرت نظام الدین میں واقع نیو ہورائزن اسکول کا بارھویں جماعت کا نتیجہ 94.3 فی صد رہا اور کوئی بھی طالب علم فیل نہیں ہوا۔ اسکول کے 170 طلبہ نے فرسٹ ڈویژن حاصل کیا جب کہ مختلف مضامین میں 68 طلبہ نے امتیازی نمبر حاصل کیے۔ مہناز فاطمہ نے 95.7 فی صد نمبر حاصل کر کے پہلی، رفعت جہاں نے 91.2 فی صد کے ساتھ دوسری اور فائزہ شرمین نے 78.8 فی صد نمبروں کے

ساتھ تیسری پوزیشن حاصل کی۔ یہ تینوں ہی طالبات کامرس اسٹریم سے ہیں۔ سائنس میں رامش اقبال نے 81.4فی صد، ثنا اسلام نے 78فی صد اور اقبال احمد نے 75.4فی صد نمبر حاصل کر کے اول، دوم اور سوم پوزیشن حاصل کی۔ آرٹس اسٹریم میں انس انور نے 74، شاہین نے 63.6اور اسما عرفان نے 59فی صد نمبر حاصل کیے۔ مہناز فاطمہ نے ریاضی، اکنامکس اور اکاؤنٹس میں بالترتیب 98، 95فی صد نمبر حاصل کیے۔

مشرقی دہلی کے اردو میڈیم اسکولوں میں اس بار پھر ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل سینئر سکنڈری اسکول کے طلبہ نے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ جمنا پار کے ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل سینئر سیکنڈری اسکول کا نتیجہ 86فی صد رہا، کامرس کے 40بچوں نے امتحان دیا ان میں 37بچے پاس ہوئے، دو کا کمپارٹمنٹ آیا اور ایک فیل ہوا۔ آرٹس گروپ کے 49بچوں میں سے 39بچے پاس، 9 کمپارٹمنٹ، ایک فیل ہوا۔ یہ نتیجے گذشتہ برسوں سے بہتر رہے جس میں اکاؤنٹس، علم سیاسیات اور اردو میں 100فی صد بچے پاس ہوئے۔ اس کے علاوہ ہندی میں 98فیصد، معاشیات میں 95، فزیکل ایجوکیشن میں 98، بزنس اسٹڈیز میں 85اور انگریزی میں 90فیصد بچے پاس ہوئے۔ امتیازی نمبر حاصل کرنے والوں میں اعجاز اسلم، محمد عمران انصاری، واصف الرحمن، محمد ارشد، شگفتہ پروین، محمد شعیب عالم اور محمد محسن کے نام قابل ذکر ہیں جنھوں نے 90فی صد سے 98فیصد تک نمبر حاصل کیے۔ پٹودی ہاؤس اسکول میں 67فیصد لڑکیاں اور 68فیصد لڑکے پاس ہوئے۔ چشمہ بلڈنگ گرلز اسکول بلیماران کا نتیجہ 85فیصد رہا جبکہ جامع مسجد نمبر ایک میں 60فیصد طلبہ پاس ہوئے۔ دوسری جانب پچھلے سال کی طرح امسال بھی آر. ایس. کے. وی. جامع مسجد 2اردو میڈیم اسکول کا بارھویں کلاس کا رزلٹ 95%رہا، جو اردو کے سرکاری اسکولوں میں سب سے بہتر ہے۔ مختلف مضامین کے کل ملا کر 23 طالبات نے مجموعی طور پر 75فیصد سے زیادہ نمبر حاصل کیے۔ ان میں آر. ایس. کے. وی. کی طالبہ حنا پروین کا بہت اچھا رزلٹ رہا ہے، انھوں نے پانچ مضامین میں سے 4میں امتیازی نمبر حاصل کیا ہے اور 2طالبات ذکیہ ناز اور فرح ناز نے تاریخ میں 93فیصد نمبر حاصل کیے ہیں۔ دیگر 5طالبات نے بھی 90%نمبر حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اس طرح کل 7طالبات نے 90فیصد یا اس سے زیادہ نمبر حاصل کیے ہیں۔ علاوہ ازیں زینت محل گرلز سینئر سیکنڈری اسکول جعفرآباد 78فیصد، گورنمنٹ بوائز سینئر سیکنڈری اسکول جعفرآباد 68فیصد، اینگلو عربک سینئر سیکنڈری اسکول اجمیری گیٹ 62فیصد، شفیق میموریل سینئر سیکنڈری اسکول 61فی صد، حکیم اجمل خاں سینئر سیکنڈری اسکول دریا گنج 59فی صد اور فتح پوری سینئر سیکنڈری اسکول کا نتیجہ 77فی صد رہا۔

(''راشٹریہ سہارا'' دہلی)

اردو میڈیم اسکولوں کے دسویں جماعت کے نتائج

● نئی دہلی، 27مئی۔ بورڈ آف اسکول ایجوکیشن دہلی کے دسویں جماعت کے نتیجوں میں جمنا پار کے ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل سینئر سیکنڈری اردو میڈیم اسکول جعفرآباد کے طلبہ اور طالبات نے شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ اسکول کا نتیجہ 82فیصد رہا۔ اس سال 82طلبہ و طالبات نے دسویں جماعت کا امتحان دیا جس میں 67بچے پاس ہوئے اور 15بچوں کا کمپارٹمنٹ آیا۔ صوبیہ سلطانہ نے اول، گلزار احمد صدیقی نے دوسری اور ناہید بشریٰ نے تیسری پوزیشن حاصل کی اور 45بچوں نے امتیازی نمبرات حاصل کیے۔ اس کے علاوہ زینت محل اسکول جعفرآباد کا رزلٹ 27فیصد رہا۔ 362طالبات نے امتحان دیا جس میں 95پاس، 78فیل اور 189 کا کمپارٹمنٹ آیا۔ بشریٰ نامی لڑکی نے 342نمبر لے کر اول پوزیشن، عظمیٰ نے 339نمبر لے کر دوسری پوزیشن اور صبا نے 335نمبر لے کر تیسری پوزیشن حاصل کی۔ نیو جعفرآباد کے بدئی ماڈرن سکنڈری پبلک اسکول کا رزلٹ سو فیصد رہا۔ 16طلبہ نے امتحان دیا جس میں 15بچے پاس ہوئے اور ایک طالبہ کا کمپارٹمنٹ آیا۔ 78فیصد نمبر حاصل کر کے عاصم نقوی نے اسکول میں پہلا مقام حاصل کیا۔ انگریزی میں عاصم نقوی نے 85، دانش نے 88عامر شمیم نے 79 شاہنواز نے 77، ریاضی میں عاصم نقوی نے 82، عامر شمیم نے 83، شاذیہ نے 82اور سائنس میں عاصم نقوی نے 82، عامر شمیم نے 76 نمبرات حاصل کر کے امتیازی کامیابی حاصل کی۔

دوسری جانب جامع مسجد پر واقع اردو میڈیم اسکول آر. ایس. کے. وی. نمبر۔2کے دسویں جماعت کا نتیجہ 90.3فیصد رہا۔ امتحان میں 31لڑکیاں شریک ہوئیں جن میں سے 28پاس ہوئیں اور تین کا کمپارٹمنٹ آیا۔ حساب میں پاس ہونے والی طالبات کا فیصد 93رہا جب کہ گذشتہ سال حساب میں 33فیصد لڑکیاں پاس ہوئی تھیں۔ زون 27میں آر. ایس. کے. وی. نمبر۔2 کا رزلٹ سب سے بہتر ہے۔ 18طالبات نے 75فیصد سے زائد نمبر حاصل کیے۔ مہ وش قریشی نے اپنے اسکول میں اول مقام حاصل کیا۔

اسی طرح فتح پوری مسلم سینئر سیکنڈری اسکول، اینگلو عربک، مظہر الاسلام سیکنڈری اسکول کا رزلٹ اوسط درجے کا رہا ہے جبکہ زینت محل سینئر سیکنڈری اسکول کا رزلٹ 12فیصد اور چشمہ بلڈنگ گرلز اسکول کا رزلٹ 6فیصد رہا۔

(''راشٹریہ سہارا'' دہلی)

انجمن ترقی اردو (ہند) جمشید پور کا جلسہ

● جمشید پور، 11مارچ۔ انجمن ترقی اردو (ہند) جمشید پور کی جانب سے تیسرے سالانہ حضرت امیر خسرو قومی اعزاز کی تقریب اور مشاعرہ یادگار داغ منعقد کیا گیا۔ اس سیمینار میں بحیثیت مہمان خصوصی پروفیسر مغنی تبسم اور

بحیثیت مہمان اعزازی ڈاکٹر لطف الرحمٰن شریک ہوئے۔ دوسرے مقررین میں کولکاتہ سے خواجہ احمد حسین تھے۔ جلسے کی نظامت پروفیسر سید احمد شمیم نے اور صدارت جناب سید رضا عباس رضوی چھمن، صدر انجمن ترقی اردو (ہند) جمشید پور نے کی۔ تیسرا حضرت امیر خسرو قومی اعزاز جناب کاوش بدری کی خدمت میں پیش کیا جانا تھا مگر دوران سفر شدید علالت کے سبب ان کو وجے واڑہ کے اسپتال میں داخل کیا گیا اور وہ تقریب میں شریک نہ ہو سکے۔ ان کی غیر موجودگی میں یہ قومی اعزاز کاوش بدری کے لیے پروفیسر مغنی تبسم نے وصول کیا۔

رات میں مشاعرہ منعقد ہوا جس میں لطف الرحمٰن، صدیق مجیبی، طاہر فراز، اقبال اشہر، شفیق اللہ آبادی، معین شاداب، تاجور سلطانہ تاج، نزہت انجم، خواجہ جاوید اختر، حسن فتحپوری، جوگا سنگھ انور، شیدا چینی وغیرہ نے شرکت کی۔ نظامت خواجہ جاوید اختر اور معین شاداب نے اور صدارت سید رضا عباس رضوی چھمن نے کی۔ (ڈاک سے)

جسٹس بشیر احمد کالج کا جشن طلائی

● جسٹس بشیر احمد سعید کالج کے قیام کے پچاس سال پورے ہونے پر کالج کے احاطے میں سہ روزہ سیمینار منعقد کیا گیا۔ اس سلسلے کا پہلا جلسہ ریاستی سطح پر بین الکلیاتی نظم خوانی کا مقابلہ ساؤدرن انڈیا ایجوکیشن ٹرسٹ کے اشتراک سے منعقد ہوا۔ نظم خوانی کا یہ مقابلہ کالج میں ہر سال منعقد کیا جاتا ہے۔ جس میں ریاست تمل ناڈو کے مختلف کالجوں سے طلبہ اور طالبات شرکت کرتی ہیں۔

جلسے کے آغاز میں شعبۂ اردو کی صدر ڈاکٹر ذاکرہ ام شہلا نے استقبالیہ تقریر کی۔ مہمان خصوصی فہیم احمد نے سیمینار کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی۔ نظم خوانی کے اس مقابلے میں محترمہ صبا مصطفیٰ اور محترمہ ثریا بیگم صاحبہ کو منصفانہ کارروائی کی ذمہ داری سونپی گئی۔ لڑکوں کے مقابلے کے لیے منصفانہ کارروائی کی ذمہ داری ڈاکٹر نثار احمد، جناب اصغر ویلوری اور جناب ملک العزیز نے نبھائی۔ مقابلے کے خاتمہ پر جیوری کے ممبران نے اپنے تاثرات پیش کیے۔ اس مقابلے میں کالجوں میں جسٹس بشیر احمد سعید کالج، سی عبد الحکیم کالج، مظہر العلوم کالج، جامعہ دار السلام کالج اور اسلامیہ کالج وانمباڑی، کوئن میرس کالج اور پریسڈنسی کالج کے طلبہ و طالبات نے حصہ لیا۔ مقابلے کے اختتام کے بعد شعبۂ اردو کی لیکچرر محترمہ انجم آرا نے ہدیۂ تشکر پیش کیا۔

شعبۂ اردو کے تحت منعقد کیا جانے والا ریاستی سطح پر دوسرا بین الکلیاتی مقابلہ: 16 جنوری کو منعقد ہوا۔ اس میں تمل ناڈو کے تیرہ کالجوں نے شرکت کی۔ اس مباحثے کا موضوع تھا کیا مسلمان خواتین اپنے حقوق اسلامی سے واقف ہیں؟ اور کیا وہ اپنے حقوق کا صحیح استعمال کر رہی ہیں؟ اس تقریب کے مہمان خصوصی ڈاکٹر سید صفی اللہ، ممبران اعزازی جناب مختار بدری اور جناب اصغر ویلوری نے سیمینار کے موضوع سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ کالج کے بانی جسٹس بشیر احمد سعید مرحوم کے فرزند جناب فیض الرحمٰن سعید جو کالج کی مجلس عاملہ کے رکن بھی ہیں نے اپنی تقریر میں اس کالج کی دیرینہ روایات اور زندگی کی اعلیٰ اقدار پر روشنی ڈالی، پھر نتیجہ کا اعلان ہوا۔ پہلا انعام جسٹس بشیر احمد سعید کالج کی طالبات کو، دوسرا انعام پریسڈنسی کالج کی ٹیم کو، تیسرا انعام جامعہ دار السلام کالج عمر آباد کو اور چوتھا انعام مظہر العلوم کالج آمبور کو دیا گیا۔

اس جشن طلائی کے تیسرے جلسے کا موضوع ''اردو ورک شاپ کا انعقاد— سال آئندہ کے اٹانومس اسٹینس کے لیے انڈر گریجویٹ طلبہ کے نئے نصاب کی تشکیل۔'' تھا جو 29 مارچ کو منعقد ہوا۔ گولڈن جوبلی تقریبات کے تحت ہونے والے اس آخری اجلاس میں سال آئندہ کے (اٹانومس اسٹیٹس) انڈر گریجویٹ طلبہ کے لیے نصاب کی تشکیل کی گئی۔ اس شعبہ کی صدر ڈاکٹر ذاکرہ ام شہلا نے ابتدا میں تعارفی خطبہ پیش کیا۔ سیمینار کے اختتام پر ڈاکٹر سعید صفی اللہ، ڈاکٹر سید سجاد حسین اور ڈاکٹر حیات افتخار نے اس سیمینار کے اغراض و مقاصد پر اپنے اظہار خیالات پیش کیے۔ (ڈاک سے)

اعزازی جلسہ

● کولکاتا، 13 مئی۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، کولکاتا اسٹڈی سینٹر کے طلبہ کی ادبی تنظیم ''بزم ادب'' کی جانب سے معروف شاعر اور یو.این.آئی. اردو سروس کے نیوز ایڈیٹر عبد السلام عاصم کے اعزاز میں مسلم انسٹی ٹیوٹ میں ایک جلسے کا اہتمام کیا گیا جس میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ کے ساتھ اردو دوستوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ عبد السلام عاصم کا تعارف پیش کرتے ہوئے نعیم انیس نے کہا کہ ان کی صحافتی زندگی کا آغاز'' اخبار مشرق'' کی اشاعت کے ساتھ ہی 1981 میں ہوا۔ ترجمہ نگاری اور خبر نگاری کا ہنر انھوں نے ڈاکٹر جاوید نہال اور جناب سجاد نظر سے سیکھا۔ مغربی بنگال اردو اکادمی کے صحافی ڈپلوما کورس میں اول پوزیشن حاصل کی۔ آزاد ہند، اقرا، عکاس، آبشار کے باوصف کسان مزدور (ہفتہ وار) میں بھی انھوں نے بحیثیت صحافی اپنے فرائض انجام دیے اور آج یو.این.آئی. سے وابستہ ہیں۔ پروفیسر سلیمان خورشید نے عبد السلام عاصم کے ساتھ اپنی رفاقتوں کا ذکر کیا۔

نوشاد مومن (مدیر ''مژگاں'') نے ان کی شاعرانہ اور صحافتی زندگی کی خوبصورت جھلکیاں پیش کیں۔ ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی، جناب اکبر مرزا، کریم رضا مونگیری، جناب سجاد نظر اور ڈاکٹر جاوید نہال نے بھی جناب عبد السلام عاصم کی شعری و صحافتی زندگی پر روشنی ڈالی۔ آخر میں جناب عبد السلام عاصم

کے اظہار خیال کے بعد طالب علم طریز احمد نے وحشت کلکتوی کی غزل سے حاضرین کو محظوظ کیا۔ پروفیسر محمد الیاس نے اپنے مختصر صدارتی کلمات سے نوازا اور آخر میں جناب اظہار عالم نے ہدیۂ تشکر ادا کیا۔ (''آبشار'' کولکاتا)

رسم اجرا

''شاعر'' گوشۂ شفیقہ فرحت

● بھوپال، 25 مئی۔ ہندوستان کے مؤقر اردو ماہنامہ ''شاعر'' (ممبئی) کے تازہ شمارے میں ممتاز اردو ادیبہ شفیقہ فرحت کے ادبی کارناموں اور ان کی زندگی کا احاطہ کرتے ہوئے گوشۂ شفیقہ فرحت کی اشاعت پر دانشوروں، ادیبوں اور صحافیوں نے خوشی کا اظہار کیا۔ ہوٹل اپسرا میں منعقد ایک تقریب میں ماہنامہ شاعر کے اس شمارے کا اجرا کرتے ہوئے تقریب کے صدر مشہور انگریزی صحافی بی ٹی جوشی نے کہا کہ محترمہ شفیقہ فرحت منفرد طنز و مزاح نگار ہیں جنھوں نے طنزیہ و مزاحیہ ادب میں سنجیدگی و وقار کے ساتھ دلچسپ انداز تحریر اختیار کر کے سماج کے ہر فرد کے جذبات کی عکاسی کی ہے۔ شفیقہ فرحت کے ادبی کارناموں اور ان کے بارے میں تاثرات کا اظہار کرنے والوں میں پروفیسر آفاق احمد، پروفیسر ضمیر الدین، عسکری زیدی، سوبتا واجپئی، اے آر خاں، پروفیسر بانو روحی، فیروزہ یاسمین اور سلطانہ جعفری کے نام قابل ذکر ہیں۔ آخر میں پروفیسر شفیقہ فرحت نے ماہنامہ شاعر اور اس کی تقریب اجرا کے ذمہ داروں کا شکریہ ادا کیا۔ (''راشٹریہ سہارا'' دہلی)

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں

● ناگپور۔ پروفیسر سید رفیع الدین سابق صدر شعبۂ اردو، عربی و فارسی، ناگپور یونیورسٹی نے ڈاکٹر محمد یٰسین قدوسی، ناظم عربی و فارسی کتبات محکمہ آثار قدیمہ ناگپور جو فی الحال تفتیش آفیسر ہیں، کی کتاب ''حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاںؒ'' کا اجرا کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر سید رفیع الدین نے صوفی غلام مصطفیٰ خاںؒ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ ان کی زندگی علم و عمل کا بہترین نمونہ تھی۔ انھوں نے تقریباً سو کتابیں تحریر کیں جن میں تاریخ، تصوف، تحقیق اور ادبیات شامل ہیں۔ انھوں نے سلسلۂ نقشبندیہ کے تحت ہزاروں مریدوں کو راہ معرفت اور نیک عمل سے ہمکنار کیا ہے۔ اجرا کی تقریب میں شمیم اعجاز، نثار اختر انصاری، الحاج یونس افسر، ڈاکٹر رضوان قدوسی، پروفیسر حبیب الحسن قادری وغیرہ موجود تھے۔ اس موقعے پر یونس افسر نے غلام مصطفیٰ خاںؒ مرحوم کو منظوم خراج عقیدت بھی پیش کیا۔ مہمان خصوصی الحاج بدیع الزماں یزدانی اور فیاض احمد یزدانی تھے۔ (ڈاک سے)

مختصرات

● مالیر کوٹلہ، 20 مئی۔ افسانہ کلب مالیر کوٹلہ کی جانب سے منعقدہ افسانوی نشست کی صدارت سماجی کارکن منشی محمد اشرف نے کی۔ اس نشست میں نوجوان افسانہ نگار سالک جمیل براڑ نے انسانوں اور جانوروں کے رشتے پر مبنی افسانہ ''بگو'' پیش کیا۔ سینئر افسانہ نگار محمد بشیر مالیر کوٹلوی نے طویل افسانہ ''مہاتما'' سنایا جس میں طب جیسے قابل قدر پیشے میں آ رہی گراوٹ پر طنز کیا گیا ہے۔ اس نشست میں پروفیسر محمود عالم، اختر علی اختر، ارشد نسیم، شیخ افتخار حسین، اجمل خاں اجمل، رشید عباس، محمد انور، اسحاق احمد اور امتیاز ساحل نے شرکت کی۔ (ڈاک سے)

● پونہ۔ ایم اے رنگون والا ٹیلنٹ ریسرچ اینڈ پروموشن اسکیم کے تحت پونہ میں ذہین طلبہ اور طالبات کو خصوصی تعلیم و تربیت دینے کے لیے ''اسکالر بیچ'' کے نام سے ایک سلسلہ جاری کیا گیا ہے۔ اس اسکالر بیچ میں داخلے کے لیے اس کے جانچ امتحان سے گزرنا یا ایس ایس سی میں اسی فیصد نمبرات حاصل کرنا لازمی ہے۔

ساتویں اسکالر بیچ کے لیے منعقدہ اس الوداعی اجلاس میں بحیثیت مہمان خصوصی مشہور افسانہ نگار جناب قاضی مشتاق احمد (سابق ایڈیشنل ڈائرکٹر محکمہ سماجی بہبود) نے اپنی تقریر میں کہا کہ اسکالر بیچ چراغ سے چراغ جلانے کا سلسلہ ہے۔ اس جلسے کی صدارت مشہور سماجی رہنما ڈاکٹر اے. آر. شیخ نے کی۔ اسکالر بیچ مشن کے بانی جناب پی. اے. انعامدار نے کہا کہ ہمارا مقصد محض اچھے ڈاکٹر، انجینئر بنانا ہی نہیں بلکہ ہم انھیں اچھے اور ذمہ دار شہری بنانا چاہتے ہیں تاکہ وہ سماج کے سامنے خصوصاً مسلم معاشرے کی صحیح تصویر پیش کر سکیں۔

اس تقریب میں محترمہ عابدہ انعام دار، جناب اعجاز خاں، جناب منور پیر بھائی، محترمہ بیگم ممتاز پیر بھائی اور جناب حسن کمال بھی موجود تھے۔ تقریب کے آخر میں جناب قاضی مشتاق احمد نے تقریری مقابلے میں منتخب طلبہ میں انعامات بھی تقسیم کیے۔ (ڈاک سے)

● برہان پور۔ بزم اردو ادب سیوا سدن کالج برہان پور کی جانب سے مادھو کالج اجین کے ڈاکٹر غلام حسین کو استقبالیہ دیا گیا اور ان کی ادبی کاوشوں پر روشنی ڈالی گئی۔ شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر محمد شفیع نے ان کا تعارف پیش کیا۔ جلسے میں کالج کے پرنسپل آر. پی. ترپاٹھی، پروفیسر ویریندر نرجھر، پروفیسر عثمان انصاری، پروفیسر وی.وی. جارج، پروفیسر سندیپ پگارے، پروفیسر شرما، ڈاکٹر سریندر جین، پروفیسر اتل کاپڑیا اور کالج کے طلبہ و طالبات موجود تھے۔ جلسے کی نظامت شفیق شیخ نے کی اور ظہیر احمد نے شکریہ ادا کیا۔

(ڈاک سے)

مشاعرے

● نئی دہلی، 24 مئی۔ ایرانی سفارت خانے کی جانب سے ایران کلچر ہاؤس میں ''شامِ غزل ایران و ہند'' کے عنوان سے ایک مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس میں ہندوستان اور ایران کے مشہور و معروف شعرا نے شرکت کی۔ اس تقریب کی صدارت معروف ادیب و شاعر پروفیسر ولی الحق انصاری نے اور نظامت انقلابی لب و لہجے کے شاعر شکیل حسن شمسی نے کی۔ اس موقعے پر پروفیسر ولی الحق انصاری کے فارسی کے تیسرے شعری مجموعے ''شب چراغ'' کا اجرا سفارت خانۂ ایران کے کلچرل کونسلر مرتضیٰ شفیع شکیب اور اردو کتاب ''کہکشاں'' کا اجرا ایرانی شعرا کے وفد کے قائد علی رضا غزوہ نے کیا۔ کلچرل کونسلر مرتضیٰ شفیع شکیب نے تمام مہمانان کا استقبال کیا اور ایران اور ہندوستان کے تاریخی اور ادبی رشتوں پر روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر ولی الحق انصاری، رفعت سروش، مخمور سعیدی، دھرمیندر ناتھ، عظیم امروہوی، واجد سحری، متین امروہوی، ابرار کرتپوری، شکیل حسن شمسی، ماجد دیوبندی، مخدوم زادہ مختار عثمانی، مرغوب حیدر عابدی، اخلاق احمد آہن، معین الحسن، حکیم غلام مہدی راز اور اسلم صدیقی نے اپنے کلام سے نوازا۔ علاوہ ازیں ایران سے آئے جن مہمان فارسی شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا ان میں علی رضا غزوہ، محمد جواد محبت، خسرو احتشامی، حسین اسرا فیلی، محمد رضا عبد الملکیان، ہادی منوری، پرویز بیگی حبیب آبادی، مصطفیٰ محدثی خراسانی، سید ضیاء الدین شفیعی، عبدالرحیم سعیدی داد، افشین اعلیٰ اور عبد الجبار کا کالی کے نام شامل ہیں۔ آخر میں ایران کے مشہور سنتور نواز محمد حسین پرنیا نے اپنے فن سنتور کا مظاہرہ کیا۔ (''راشٹریہ سہارا'' دہلی)

● جونپور، 6 مئی۔ الظہیر سوسائٹی جونپور کی جانب سے ایک کل ہند مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کی نظامت انور جلال پوری نے اور صدارت ڈاکٹر مظفر حنفی نے کی۔ مشاعرے کا افتتاح ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے کیا اور مہمانِ خصوصی جناب کے. پی. سنگھ (وائس چانسلر پور وانچل یونیورسٹی، جونپور) تھے۔

مشاعرے میں جن شعرائے کرام نے شرکت کی ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔ مخمور سعیدی، زبیر رضوی، اظہر عنایتی، مظفر رزمی، معراج فیض آبادی، ساغر خیامی، شاہد ماہلی، رہبر جونپوری، شاعر جمالی، جوہر کانپوری، نظر ایٹوی، آفاق فاخری، اقبال اشہر، عتیق اللہ آبادی اور خواجہ جاوید اختر۔ مشاعرے کے کنوینر زبیر اعظمی سحر تھے۔ (ڈاک سے)

● پنچکولہ، 23 مئی۔ ہریانہ اردو اکادمی کی جانب سے نارتھ زون کلچرل سینٹر کے تعاون سے کلاگرام چنڈی گڑھ میں استاد الشعرا نواب مرزا خاں داغ دہلوی کے یوم پیدائش کے موقعے پر ایک کل ہند طرحی مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کا افتتاح وزیرِ تعلیم ہریانہ عزت مآب پھول چند ملانا نے کیا۔ جن شعرا نے اس مشاعرے میں شرکت کی ان میں مظفر رزمی، آرزی شرما تاثیر، حق کانپوری، ناز نہٹوری، مہندر پرتاپ چاند، ویدیوانہ، دوست بھاردواج، رعنا زیبا، دل کاشمیری، ڈاکٹر کے.بی. دوبے، شمس تبریزی، عرش صہبائی اور ڈاکٹر شباب للت کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ مشاعرے کی نظامت شمس تبریزی نے کی۔ جناب آر. ٹی. جندل (آئی.اے.ایس.) ڈائرکٹر نارتھ زون کلچرل سینٹر پٹیالہ نے تمام شرکا اور سامعین کا خیر مقدم کیا۔ (ڈاک سے)

جانے والوں کی یاد

سردار ہربجن سنگھ تھاپر

● نئی دہلی۔ اردو کے قدیم ترین رسالے ماہنامہ ''رہنمائے تعلیم'' کے منیجنگ ایڈیٹر، بزرگ اردو صحافی سردار ہربجن سنگھ تھاپر کا 7 جون کو اپنی قیام گاہ پر انتقال ہو گیا۔ وہ پچھلے چند ماہ سے صاحب فراش تھے۔ 87 سالہ سردار ہربجن سنگھ غیر منقسم پنجاب کے پنڈی کیمپ میں سردار صاحب ماسٹر جگت سنگھ بانی رسالہ ''رہنمائے تعلیم'' کے یہاں 13 مارچ 1920 کو پیدا ہوئے۔ اعلیٰ تعلیم لاہور میں پائی اور پھر لاہور کے پنجاب سکریٹریٹ میں ملازم ہو گئے۔

وہ جگت سنگھ جی کے کہنے پر 1939 میں ملازمت چھوڑ کر ان کے ساتھ رسالہ رہنمائے تعلیم سے وابستہ ہو گئے۔ 1947 میں ملک کی تقسیم کے وقت دہلی آ گئے اور یہاں آ کر اپنے والد صاحب کے ساتھ رسالہ رہنمائے تعلیم کی ذمہ داریاں اپنے کاندھوں پر لے لیں اور اسے صدی کی دہلیز تک پہنچا کر اردو صحافت کی تاریخ رقم کی۔ سردار جگت سنگھ تھاپر نے تقسیم ملک کے دوران بھی رسالے کی اشاعت کا تسلسل جاری رکھا۔ اس زمانے میں انھیں لاہور سے ہجرت کر کے دہلی میں پناہ لینی پڑی۔ اس صورت حال میں بھی انھیں دہلی میں تباہ حال اپنے کنبے کے لیے رہنے کا ٹھکانہ تلاش کرنے اور دیگر ضروریات زندگی کی اتنی فکر نہ تھی جتنی رسالے کو جاری رکھنے کی فکر تھی۔

چنانچہ اسی بے سروسامانی کے عالم میں انھوں نے دہلی سے ماہ اگست تا دسمبر 1947 کا مشترکہ شمارہ نکال کر ہی دم لیا۔ سردار ہربجن سنگھ تھاپر نے اپنے والد کی روایت کو باقی رکھا۔ حال ہی میں انھوں نے ''رہنمائے تعلیم'' کا خصوصی شمارہ صد سالہ نمبر شائع کیا تھا جس کی ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی ہوئی۔ ملک کے متعدد ادبی اداروں، انجمنوں اور علمی و ادبی شخصیات نے تھاپر صاحب کی موت پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔

□□□

تبصرہ و تعارف

کلیاتِ آغا حشر کاشمیری
مرتبین: آغا جمیل کاشمیری/ یعقوب یاور
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔ 1، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066
کل صفحات: 2764، (سات جلدوں پر مشتمل) قیمت:-/1151 روپے
مبصر: اقبال مجید، 132، کوہِ فضا ہاؤسنگ بورڈ کالونی بھوپال۔460201 (مدھیہ پردیش)

سات جلدوں پر مشتمل اس عمدہ سیٹ کے مشمولات کی تفصیل مندرجۂ ذیل ہے۔

پہلی جلد: آفتابِ محبت، مُریدِ شک، مارِ آستین، اسیرِ حرص (یہ ابتدائی ڈرامے ہیں جو 1897 سے 1901 کے درمیان لکھے گئے)۔ دوسری جلد: شہیدِ ناز، سفید خون، صیدِ ہوس (یہ ڈرامے 1902 سے 1907 کے درمیان لکھے اور اسٹیج ہوئے)۔ تیسری جلد: خوابِ ہستی، خوبصورت بلا، سلور کنگ (1908 سے 1910 کے درمیان اسٹیج ہونے والے ڈرامے۔) چوتھی جلد: یہودی کی لڑکی، ترکی حور، رستم سہراب (1911 سے 1929 کے درمیان لکھے اور کھیلے گئے)۔ پانچویں جلد: بلوا منگل، مدھر مُرلی، بھارت رمنی، بھگیرتھ گنگا، (یہ ڈرامے 1914 سے 1920 کے درمیان کی تصنیفات ہیں۔) چھٹی جلد میں پراچین ایوم نوین بھارت، سنسار چکر، بھیشم پرتگیا، آنکھ کا نشہ (1921 سے 1924 کے درمیان لکھے گئے)۔ ساتویں جلد:۔ سیتا بن واس، دھرمی بالک، بھارتی بالک، دل کی پیاس (1928 سے 1931 کے درمیان لکھے گئے۔)

اس طرح آغا حشر کے پہلے ڈرامے آفتابِ محبت (1897) سے آخری ڈرامے 'دل کی پیاس' (1931) تک لکھے گئے تمام 25 ڈرامے ضروری تفصیلات اور پس منظر کے ساتھ کونسل نے سلیقے سے شائع کیے ہیں۔ ایسی صورت میں جب کہ آغا حشر کے ڈرامے بلا اجازت چھاپنے والے ناشرین نے ان کے اصل متن کے ساتھ بڑی ناانصافیاں کی ہوں اور نہ سمجھ میں آنے پر اس میں اپنی طرف سے جاہلانہ اضافے کیے ہوں، ڈراموں کے معیاری اور درست متون کو دستیاب کرنے کا کام آسان نہ تھا جس کو آغا جمیل کاشمیری اور یعقوب یاور نے خانوادۂ حشر کی تیسری نسل سے تعلق رکھنے والے جناب نہال احمد شاہ کاشمیری کے اشتراک سے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا ہے۔

یہ بات مشہور ہے کہ آغا حشر بیک وقت کئی منشیوں کو بٹھا کر ڈراما بول بول کر لکھوایا کرتے تھے، نیم خواندہ منشیوں کا املا اکثر غلط ہوا کرتا تھا، لہٰذا مسودوں میں املا درست کرنا یا قدیم املا کو جدید املا میں تبدیل کرنے کا کام بھی مرتبین نے انجام دیا ہے۔ بعض مسودوں میں ڈرامے کے ہدایت کار نے (آغا حشر خود ہی ہدایت کاری بھی کیا کرتے تھے) مناظر سے متعلق تفصیلات اور دیگر ہدایات نہیں تحریر کی ہیں۔ مرتبین نے ان کی تکمیل بھی کر دی ہے۔ ڈراموں کا سنۂ تحریر، حاصل شدہ اکثر مسودوں کی شکلِ ظاہری کی تفصیل اور بعض ڈراموں میں ان کے کاتبوں کے ناموں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔

ہر ڈرامے کے آغاز سے قبل ایک مختصر نوٹ بھی تحریر کیا گیا ہے جس میں مرتبین کی نظر سے گزرنے والے اس ڈرامے سے متعلق مسودوں کی تعداد، ان کی کیفیت، سنہ تحریر اور سب سے پہلے وہ ڈراما کہاں اور کس کمپنی کے بینر تلے کھیلا گیا، وغیرہ کارآمد معلومات بہم کی گئی ہیں۔ ''یہودی کی لڑکی'' کو متعارف کراتے ہوئے لکھا گیا ہے ''اس ڈرامے کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے آغا حشر نے اس کا دوسرا حصہ ''مشرقی حور'' عرف ''شیر کی گرج'' کے نام سے لکھا تھا جو مکمل شکل میں دستیاب نہیں ہے۔ حشر کے ادبی ذخیرے میں مشرقی حور کا ایک ناقص مسودہ موجود ہے جو الگ الگ کاغذ کے پرزوں پر لکھے ہوئے مکالمات کی شکل میں ہے۔'' اسی طرح جلد پنجم کے پہلے ڈرامے ''بلوا منگل'' کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ ''ہندی زبان اور ہندو دھرم کو موضوع بنا کر لکھا گیا یہ ان کا پہلا ڈراما ہے جسے پہلی بار ان کے چھوٹے بھائی آغا محمود شاہ کاشمیری کی ہدایت میں اسٹیج کیا گیا... مختلف اوقات میں اسے ''بھگت سور داس'' اور ''بلوا منگل'' کے نام سے بھی کھیلا گیا ہے۔ ڈراموں کے سنہ تحریر کے سلسلے میں جو اختلافات محققین میں پائے جاتے ہیں ان کے مدِ نظر آغا حشر کے خاندانی ذخیرے سے دستیاب کاغذات کی بنیاد پر ڈرامے کی تصنیف کا زمانہ متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ کلیات میں شامل کیا جانے والا مسودہ کن وجوہ کی بنا پر زیادہ مستحب اور مستحسن سمجھا گیا اور اشاعت کے لیے منتخب کیا گیا۔

13 صفحات پر مشتمل دیباچہ میں ہندوستان میں ڈرامے کی روایت کا سرسری جائزہ لینے کے بعد آغا حشر کے حالات زندگی بیان کیے گئے ہیں جن سے حشر کے خاندان، تاریخ ولادت، ڈرامے سے رغبت، مختلف جگہوں پر قیام اور تھیٹریکل کمپنیوں میں ملازمت وغیرہ پر روشنی پڑتی ہے لیکن اس سے علمی، تہذیبی اور سیاسی پس منظر کو سمجھنے میں مدد نہیں ملتی اور نہ ہی یہ حشر کے ذہن کی تعمیر کرنے والے نظریات، رجحانات، شخصیات اور تحریکات سے آگاہی

ہوتی ہے۔ آغا حشر نے داغ کے کلام کا ڈنکا بجتے سنا تھا، ابوالکلام آزاد کی صحبت کا فیض اٹھایا تھا، عیسائی پادریوں کے مناظرے دیکھے تھے، گاندھی جی کے اخبار ینگ انڈیا (Young India) کا مطالعہ کیا تھا، لارڈ کرزن کے اقتدار کی کلفتیں برداشت کی تھیں، بازوئے قاتل سے پنجہ کشی کرنے والے وطن کے سرفروشوں کو داد دی تھی اور ڈاکٹر محمد اقبال جیسے عظیم شاعر کے ساتھ مشاعروں میں کلام پڑھا تھا۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ حشر کی ڈرامائی تخلیقات کو یکجا کرنے کے اس منصوبے میں حشر کے زمانے کے تھیٹر اور اس کے فن کو سمجھنے کے لیے بھی کچھ صفحات مختص کر لیے جاتے کیوں کہ ڈراما بنیادی طور پر فنِ ادائیگی (Performing Art) سے تعلق رکھتا ہے۔ کلیات میں آغا حشر کے تھیٹر کے محاورے اور اس کے اجزا پر بھی کچھ روشنی ڈالی گئی ہوتی تو اس کی توقیر اور اہمیت میں مزید اضافہ ہو جاتا کیوں کہ جیسے جیسے وقت گزر رہا ہے پارسی تھیٹر کی فنی خوبیوں اور خامیوں سے واقفیت رکھنے والے بزرگ حضرات تھیٹر کی بساط سے اٹھتے جا رہے ہیں بلکہ بہت حد تک اٹھ چکے ہیں اور اس زاویے سے اب تک اردو میں جس قدر کام ہوا ہے وہ نہ تو منصوبہ بند ہے اور نہ شیرازہ بند۔

لازمی ہے کہ اردو ڈرامے کا مطالعہ، کلاس روم کے طور طریقوں سے باہر نکل کر ورک شاپ کے طور طریقوں کے مطابق ہو کیوں کہ ڈراما ناول کی طرف فنِ بیان نہیں ہے۔ وہ تو معاشرے کے صفحات پر تہذیبی روایات کی روشنائی سے اور فن کے اجتہادی قلم میں روایات سے انحراف کی قوت کے بل بوتے تھیٹر کے محاورے میں بہت حد تک پہلے کھیلا جاتا ہے اور پھر کھیل شروع ہونے کے چند گھنٹوں پہلے تک کاغذ پر لکھا اور کاٹا جاتا ہے۔

بلا شبہ کلیات آغا حشر کاشمیری کی اشاعت اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے ناقدین اور محققین کو حشر کی تخلیقات کی تلاش میں بھٹکنے سے بچالے گی اور انھیں حتی الامکان حشر کے ڈراموں کے مروجہ مسودوں میں بہتر سے بہتر مسودے کے مطالعے کا موقع عنایت کرے گی جس کے لیے اس کے مرتبین اور قومی اردو کونسل مبارک باد کے مستحق ہیں۔

بے زبانوں کی دنیا/حیدر بیابانی

صفحات: 128، قیمت:-/29 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، ونگ۔6،
آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066

مبصر: شہاب ظفر اعظمی، شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ۔ (بہار)

قومی اردو کونسل نے بچوں کے مشہور شاعر حیدر بیابانی کی 44 نظموں پر مشتمل مجموعہ ''بے زبانوں کی دنیا'' حال ہی میں شائع کیا ہے۔ ان نظموں میں جانوروں اور پرندوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ سبھی نظمیں دلچسپ اور بچوں کے ذوق کے مطابق ہیں۔ ان نظموں میں موسیقیت اور نغمگی ہے۔ الفاظ، بہت آسان اور سلیس استعمال کیے گئے ہیں۔ بچے خوب صورتی اور عجائبات سے متاثر ہوتے ہیں اس لیے جانوروں کے دلچسپ واقعات اور ان کی لفظی تصویریں بھی پیش کی گئی ہیں اور باتوں ہی باتوں میں ایسے خیالات ظاہر کیے گئے ہیں جو بچوں میں عزم، جوش، مسرت، خوشی، ہمدردی، رواداری، انصاف اور ہمدردی کے جذبات پیدا کرتے ہیں۔ کتاب میں شامل اکثر نظمیں بالخصوص شکوہ جانوروں کا، ٹی پارٹی، کیوں مجھے ستاتے ہو، بندر کی کرنی، جنگل میں مشاعرہ، قومی جانور، فرض، الیکشن، چاند اور سورج، تکرار، چوہوں کی یونین، طوطا بولے، پیڑ کی فریاد اور پھول کی دعا وغیرہ نہایت آسان، سادہ اور شگفتہ زبان میں ہیں۔ بچے انھیں آسانی سے سمجھ سکتے ہیں اور ان کے آہنگ سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ بعض نظموں میں چھوٹی چھوٹی کہانیاں بھی پیش کی گئی ہیں اور ان کہانیوں سے اخلاقی نتائج بھی اخذ کیے گئے ہیں۔ ایسی نظموں میں خواب، ٹی پارٹی، دو چالاک مدھو کوا، بندر کی کرنی، گدھے کی نوکری، بلی کا پروگرام، چالاک خرگوش، سزائے موت اور چوہوں کی یونین بطور خاص شامل ہیں۔

حیدر بیابانی کو زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے۔ اکثر اشعار بچوں کے ذہن و دل پر اثر قائم کرنے کی قوت رکھتے ہیں۔ قومی اردو کونسل نے ان نظموں کو خوب صورت گیٹ اپ کے ساتھ بہت کم قیمت میں شائع کر کے بچوں کے لیے بیش قیمت تحفہ پیش کیا ہے۔

راجدھانی میں ایک مہم (ناولٹ)

مصنف: دیپا اگروال

مترجم: صغرا مہدی

صفحات: 120، قیمت:-/26 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، ونگ۔6،
آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066

مبصر: عبدالرحمن مظہری 24۔ پیریار ہاسٹل، جے۔این۔یو، نئی دہلی۔67

دیپا اگروال کا ناولٹ ''راجدھانی میں ایک مہم'' بچوں کے لیے لکھا گیا ہے۔ اس کے پلاٹ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ بچے اپنے تفریحی مشاغل کے دوران کتنے اہم کارنامے انجام دے سکتے ہیں۔ امت، ہیرا اور اس کے رشتے کی بہن ببلو اچھے دوست ہیں۔ ایک خوشگوار حادثے کے بعد ان کی دوستی روہن سے ہو جاتی ہے۔ روہن انھی کے محلے کے ایک خوشحال انجینئر کا اکلوتا لڑکا ہے۔ ایک دن روہن کے گھر سے اس کے پاپا کا بریف کیس چوری ہو جاتا ہے جس میں کچھ نئی مشینوں کے منصوبے تھے۔ منصوبہ واپس کرنے کے لیے چوروں نے روہن کے پاپا سے ایک لاکھ روپیہ طلب کیا۔ روہن کے پاپا نے روپے دینے سے پہلے ایک پرائیویٹ جاسوس کی مدد لی لیکن نتیجہ صفر رہا۔ ادھر ان چاروں دوستوں نے اپنے طور پر چور کا پتہ لگانے کے لیے جاسوسی شروع کر دی اور آخر میں اپنی ہمت اور سمجھ بوجھ سے نہ صرف چوروں کا پتہ لگایا

بلکہ انھیں پولیس کے ہاتھوں گرفتار کرا کے اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔

اس ناولٹ میں اس ذہنیت پر بھی طنز ہے جس کے تحت لڑکیوں کی تعلیم کو غیر ضروری سمجھا جاتا ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''بہن جی آپ! اسے کام کرنے دیں'' موہنی کی ماں نے کہا'' یہ پڑھ لکھ کر کیا کرے گی، اسے اپنی زندگی میں آگے چل کر برتن ہی تو دھونا ہے۔''

یہ سن کر بھلو برداشت نہیں کر سکی اور زور سے چیخی'' بیوقوف عورت اگر یہ پڑھ لکھ لے گی تو کوئی اور کام کرے گی۔ تم چاہتی ہو کہ وہ زندگی بھر جاہل رہ کر دوسروں کی نوکری کرتی رہے'' (ص:15) مترجم کی زبان سادہ اور سلیس ہے۔

امید ہے کہ یہ کتاب قارئین کو پسند آئے گی۔

جانشین داغ بھائی جان عاشق

مرتب: سنجے گوڈبولے

سائز ڈیمائی، صفحات 86، قیمت :-/60 روپے

ناشر: سنکشیا پبلی کیشنز، 847، بدھوار پیٹھ، پونے 411002

مبصر: محمود سعیدی، جے-3/141 سی، کرشنا کنج ایکسٹنشن، لکشمی نگر، دہلی-92

سنجے گوڈبولے کی پیدائش 19 مئی 1964 کو پونے میں ہوئی۔ ان کی مادری زبان مرہٹی ہے لیکن وہ اردو، فارسی، عربی اور انگریزی زبانوں پر بھی دسترس رکھتے ہیں۔ سنجے گوڈبولے کو ادب و ثقافت کے علاوہ نوادرات و مخطوطات سے اپنے زمانۂ طالب علمی ہی سے دلچسپی رہی ہے۔ ان کی عمر صرف تیرہ سال کی تھی تو انھیں ایک پرانے سامان کی دکان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا کیشر سرٹیفکٹ دستیاب ہوا جو انھوں نے پونے یونیورسٹی کے اس وقت کے وائس چانسلر پوتے دار تک پہنچایا۔ اس واقعے سے وائس چانسلر بہت متاثر ہوئے اور یہ پیشین گوئی کی کہ مستقبل میں یہ لڑکا بڑا محقق بنے گا۔ یہ پیشین گوئی بالکل سچ ثابت ہوئی۔ سنجے قدیم ترین سکوں، مہروں، گھریلو اشیا اور اس طرح کی دوسری چیزوں کی فراہمی کے لیے بھاری سے بھاری قیمت ادا کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کرتے۔

گوڈبولے صاحب نے تین مضامین میں ایم.اے. کی سند حاصل کی ہے۔ علم آثار قدیمہ میں پونے یونیورسٹی سے تواریخ اور ہندوستانیات (Indology) میں تلک یونیورسٹی سے ایم.اے. کی سند حاصل کی ہے۔ انھوں نے پونے یونیورسٹی سے بی.کام اور ایل.ایل.بی. کی اسناد بھی حاصل کی ہیں۔ علاوہ ازیں رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن اور رائل نیوسمنک سوسائٹی لندن سے انھیں فیلوشپ بھی تفویض کی جا چکی ہے۔ فی الوقت بھارت اتہاس سنشودھن منڈل، پونے، Indian History Congress، دہلی، Epigraphical Society of India میسور، Oriental Numismatie Society لندن، Numismatie Society of India دارانسی، Patron of International Collectors Society of rare Items مہاراشٹر کے ممبر ہیں اور Numismatic Society of Maharashtra جو پونے میں ہے اس کے بانی کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔

سنجے گوڈبولے کے اب تک 500 مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ وہ اردو کے ایک اچھے غزل گو بھی ہیں۔ مختلف زبانوں میں ان کی اب تک نو(9) کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ انگریزی زبان میں "Cains Collection for Beginners" مراٹھی میں ''پونے کے اردو شعرا کا انتخاب'' اور ''شرح مرزا غالب'' کے علاوہ اردو میں ''پروفیسر ظہیر ورما احوال و شاعری'' ''دیوان میر دوم'' ''کالی داس گپتا: فن اور شخصیت'' حیدر قریشی: فن اور شخصیت'' ''جانشین داغ بھائی جان عاشق'' اور'' غالبیات پر تین یادگار تقریریں'' قابل ذکر ہیں۔

صاحبزادہ احمد سعید خاں عاشق عرف بھائی جان اپنے زمانے کے مقبول شاعروں میں تھے۔ انھیں یکے بعد دیگرے مولانا حالی، داغ اور ظہیر دہلوی کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا اور آخر میں وہ خود بھی مرتبۂ استادی پر فائز ہوئے۔ سیماب اکبر آبادی نے انھیں داغ کے نورتنوں میں شامل کیا ہے۔ افسوس ہے کہ ان کا دیوان نہ ان کی زندگی میں شائع ہوا نہ ان کے انتقال کے بعد جس پر اب 64 برس گزر چکے ہیں۔ ان کا انتقال 15 ستمبر 1940 کو ہوا۔ مشہور و معروف تاریخ گو حافظ عبید اللہ البصر نے ان کے انتقال پر حسب ذیل شعر کہا تھا جس کے مصرعۂ اولیٰ سے سن ہجری (1359) اور مصرعۂ ثانی سے سن عیسوی (1940) برآمد ہوتا ہے:

خوبانِ دلبرانِ زماں را بگو عبید   عاشق برفت ناز و ادا از برائے کیست

مالک رام نے ''تذکرۂ ماہ و سال'' (ص 528) میں ان کا سالِ وفات 1957 لکھا ہے جو سراسر غلط ہے۔ 1957 میں عاشق کے انتقال کو 17 برس ہو چکے تھے۔

زیر نظر کتاب عاشق صاحب کے مکمل حالاتِ زندگی اور پورے کلام پر مشتمل نہیں ہے۔ اس میں مختصر سا تعارف اور صرف 'ی' کی ردیف کی غزلیں شامل ہیں اور یہ اس مخطوطے پر مبنی ہیں جو مرتب کی ملکیت ہے۔ ان کی اطلاع کے مطابق ''مخطوطے کا سائز 21x16 سینٹی میٹر ہے۔ کلام کاغذ کے دونوں طرف مسلسل تحریر کیا گیا ہے، کل 26 صفحات ہیں۔ آخری نو صفحے میں تحریر بدل گئی ہے'' کتاب کے شروع میں مرتب کے ''ابتدائیہ'' کے علاوہ جس میں انھوں نے راجستھان کی جغرافیائی اور تاریخی خصوصیات کے علاوہ وہاں کی تمدنی اور معاشرتی فضا نیز علمی و ادبی ماحول کا ذکر کیا ہے سید منظور الحسن برکاتی مرحوم کی ایک تحریر بھی شامل ہے جس میں اختصار کے ساتھ ٹونک کے ادبی اور

شعری ماحول اور عاشق صاحب کی زندگی اور شاعری پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کے دوستوں اور شاگردوں کا بھی ذکر ہے۔

عاشق صاحب کا کلام ان کے زمانے کے مروجہ مذاقِ سخن کا آئینہ دار ہے۔ وہ چونکہ اپنے اساتذہ میں زیادہ مدت تک داغ کے دامنِ فیض سے وابستہ رہے اس لیے ان کے کلام میں زبان و بیان کی صفائی کے ساتھ ساتھ معاملہ بندی کا رنگ زیادہ نمایاں ہے۔ کلام میں معنوی گہرائی نظر نہیں آتی۔

کتاب کے سرورق پر عاشق صاحب کی جو تصویر دی گئی ہے، وہ یقیناً ان کی نہیں ہے۔ میں نے ان کی تصویر دیکھی ہے جو ان کے شاگرد حبیب اللہ خاں فضائی کے رسالے ماہنامہ "کیف" اجمیر میں شائع ہوئی تھی۔ وہ داڑھی نہیں رکھتے تھے نہ شاہانہ لباس پہنتے تھے۔ یہ بانی ریاست ٹونک نواب امیر خاں کی تصویر ہو سکتی ہے جو عاشق صاحب کے جد اعلیٰ تھے۔ نجیے گوڑ بولے صاحب تحقیق سے دلچسپی رکھتے ہیں، انھیں بلا تحقیق اس تصویر کو عاشق صاحب کی تصویر نہیں سمجھ لینا چاہیے تھا۔ مشمولہ کلام بھی پورا کا پورا عاشق صاحب کا معلوم نہیں ہوتا۔ شروع کی بعض غزلیں عاشق صاحب کے معروف رنگِ سخن سے متغایر ہیں۔

اصطلاحات نقد و ادب

مولف: عمر فاروق

صفحات: 302، قیمت: -/200 روپے

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی، ممبئی اور علی گڑھ۔

مبصر: نامی انصاری، 93/295، لاٹا روڈ، چمن گنج، کانپور۔ 208001

عمر فاروق نے اس کتاب میں 1947 تک کی اردو تنقید میں رائج اصطلاحات کو جمع کیا ہے اور ہر اصطلاح کی تشریح مختلف زاویوں سے کی ہے۔ اگر کسی اصطلاح کا مفہوم غیر واضح ہے تو اس کے ہر پہلو پر بحث کی گئی ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ قاری کے سامنے اس کی ادبی و معنوی صورت واضح ہو جائے۔ مثال کے طور پر "رومانیت" کے تصور کو واضح کرنے کے لیے انھوں نے لوکاچ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اب تک رومانیت کی 11369 تعریفیں بیان کی جا چکی ہیں۔ تعبیر کی اسی کثرت نے اس کو بے حد پیچیدہ بنا دیا ہے، یہاں تک کہ بعض ناقدین نے اس کو ایک بے معنی اصطلاح قرار دے دیا ہے، جب کہ واقعتاً ایسا نہیں ہے۔ اس ضمن میں مولف نے فرانسیسی مفکر روسو کے سیاسی، معاشرتی اور تعلیمی نظریات کو رومانیت کی بنیاد قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ "روسو نے مغربی تہذیب کے تصنع اور سخت گیر ضابطوں کے خلاف، حریت اور اخوت و مساوات کا نعرہ بلند کیا۔ خصوصاً اس کے یہ الفاظ کہ انسان آزاد پیدا ہوا ہے مگر جہاں دیکھو وہ پا بہ زنجیر ہے، رومانی تحریک کا مطلع اول ہے۔" اردو میں اقبال کی شاعری میں بھی رومانیت کے کافی اثرات پائے جاتے ہیں۔

مولف نے پیکر، جمالیات، شعور کی رو، عقلیت، فسطائیت، جدلیاتی مادیت، کلاسکیت، اجتماعی لاشعور اور نشاۃ الثانیہ جیسی دقیق اصطلاحوں پر سیر حاصل بحث کر کے ان کو آسان اور قابلِ فہم بنانے کی کافی کوشش کی ہے۔ وضاحت کے لیے انھوں نے مختلف النوع خیالات کا سہارا لیا ہے اور متعدد علمائے ادب مثلاً سید عابد علی عابد، خلیل الرحمٰن اعظمی، شمس الرحمٰن فاروقی، شمیم حنفی، دیویندر اسّر، قمر رئیس، ممتاز حسین، جمیل جالبی، آل احمد سرور اور وزیر آغا کی تحریروں سے استفادہ کیا ہے۔ ریختی کو مولف نے ایک متروک صنفِ سخن قرار دیا ہے اور اس کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:۔

"عورتوں کے جذبات و احساسات اور واردات و معاملات کو انھی کی زبان محاورے اور روز مرہ میں ادا کرنے والی صنفِ شاعری کو ریختی کہتے ہیں۔" میں سمجھتا ہوں کہ ریختی کی یہ ایک جامع تعریف ہے مگر مثال میں انھوں نے جان صاحب کے جو چند اشعار لکھے ہیں ان کے مفاہیم سے مزید ابہام پیدا ہو جاتا ہے اور بات واضح نہیں ہوتی ہے۔ ریختی کے بہت سے شعر بہت مشہور ہیں جن میں نسوانی جذبات کی عکاسی کے ساتھ ساتھ روز مرہ اور محاورے کا لطف بھی اپنے عروج پر ہے مثلاً:

ذرا گھر کو رنگیں کے تحقیق کر لو
یہاں سے ہے کے چپے کی ڈولی، کہارو!

ریختی کے ضمن میں مولف نے یہ بھی لکھا ہے کہ "نسائیت اور فحش گوئی سے ریختی کا خمیر تیار ہوتا ہے۔" بہ اعتبار مجموعی یہ کتاب طلبہ اور میدانِ تنقید کے نو واردوں کے لیے مفید ہے۔

بڑے شہر کا خواب

مصنف: پرویز شہریار

تقسیم کار: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی۔ 6

صفحات: 158، قیمت: -/125 روپے

مبصر: ایس۔ اے۔ رحمٰن، 1669، تیسری منزل، کوچہ دکھنی رائے، دریا گنج، دہلی۔ 110002

پرویز شہریار، سید پرویز احمد کا قلمی نام ہے۔ زیرِ تبصرہ افسانوی مجموعے میں تیئیس افسانے ہیں۔ اس میں علامتی، تمثیلی اور روایتی بھی قسم کے افسانے شامل ہیں۔ ان میں ہیئت اور تکنیک کے تجربے بھی ہوئے ہیں اور ان افسانوں میں سماج کے گوناگوں مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔

پرویز شہریار نے ہر طرح کے فنی تجربے کیے ہیں۔ شروع میں جدیدیت کے رجحان سے اثرات قبول کیے اور بعض علامتی اور تجریدی افسانے بھی لکھے۔ ان کا ایک علامتی افسانہ 'نئی روشنی کا آخری ڈراما' کے عنوان سے 1985 میں اور 1986 میں "سایہ سایہ جنگل" اشاعت پذیر ہوا۔ پرویز شہریار کو اپنی بات سے قارئین کو متاثر کرنے کا سلیقہ آتا ہے۔ "حالات کے مارے"

افسانے میں بوڑھے والدین کی بے کسی اور بے بسی کا اظہار اس طرح کیا ہے:

"زمین خالی چھوڑنا ہی نہیں چاہیے، لیکن اس کے ضعیف والد کیا کرتے، بیٹوں کو اس کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ گھر چھوڑ دلی، ممبئی جا بسے تھے۔ ماں باپ نے پال پوس کر بڑا کر دیا، شادی بیاہ ہو گیا تو اپنا گھر دوار الگ بسانے چلے گئے۔ انھیں (ماں باپ کو) کیا فائدہ ہوا؟ آدمی درخت لگاتا ہے پھل کھانے کے لیے لیکن یہاں تو ذرا بال و پر نکلے اور چڑیا کی طرح پھر سے اڑ گئے۔ بچہ جب تک چھوٹا ہوتا ہے لخت جگر اور آنکھوں کا تارا ہوتا ہے لیکن جب والدین بوڑھے ہو جائیں تو وہ نہ آنکھوں کا نور بنتا ہے اور نہ بڑھاپے کی لاٹھی۔" (ص: 37) افسانہ "جرم ضعیفی کی سزا" میں بھی ایسے ہی حقائق کا اظہار ہے۔ "سایہ سایہ جنگل"، "رنگ اضطراب" اور "جولان گاہ کی ور" پڑھ کر انڈرسن کی کہانیاں یاد آتی ہیں جو محیر العقول ہیں مگر دل کو چھو لیتی ہیں "سایہ سایہ جنگل" اور "نئی روشنی کے سوانگ" علامتی افسانے ہیں جن میں نئے سماج اور دوڑتی بھاگتی زندگی کو تجریدی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ "سایہ سایہ جنگل" سے یہ چند سطریں ملاحظہ کریں۔ یکا یک چند کتوں کے غول نے مجھ پر حملہ بول دیا... چاروں طرف کتوں کے سر ہی سر نظر آ رہے ہیں۔ میں نے بے تحاشا بھاگتے ہوئے آنکھیں پشت پر رکھ کر دیکھا، وہ دیوانہ وار میرا تعاقب کر رہے ہیں.... یہ ٹھیک ہے، میں نے برانچ منیجر کی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے سوچا "اب میں محفوظ ہوں۔".....میں دنگ رہ گیا۔ میری صورت رفتہ رفتہ بندر کی ہو گئی۔" "حالات کے مارے" اور "جرم ضعیفی کی سزا" بڑھاپے کی مجبوریوں اور زندگی و سماج کی گرتی قدروں کو سامنے لاتے ہیں تو "جولان گاہ کی حد" اور "رنگ اضطراب" کا انداز پیش کش مشہور مغربی قلمکار ہینس انڈرسن کے اسلوب کی یاد تازہ کرتا ہے۔ "داسی تیرے چرنوں کی" کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اچھی عورت اپنی ہمت و حوصلے اور محبت سے برے افراد کو بھی اچھا شہری بنا سکتی ہے۔ مجموعی طور پر پرویز شہریار کے یہ افسانے حقائق کا اظہار ہیں۔ امید ہے کہ قارئین کو یہ افسانے پسند آئیں گے۔

□□□

ہری بھری دنیا کے لیے

مصنف: ایما سکینہ/ مترجم: طلعت گل

ایک دلچسپ سائنس فکشن جس میں دوسری دنیا کی مخلوقات کے ساتھ مل کر ہماری دنیا کے بچے ایک مہم پر روانہ ہوتے ہیں اور اس میں کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

صفحات: 118، قیمت:-/28 روپے

شہر میں ایک جنگل

مصنف: کمارن ست سیوم/ مترجم: عباس آصف

چینئی (مدراس) غالباً دنیا کا واحد شہر ہے جس کی حدود کے اندر حقیقی معنوں میں جنگل کا وجود ملتا ہے۔ اس کتاب میں آئی آئی ٹی چینئی کے جنگل میں مصنف اور اس کے دوستوں نے جو تجربے کیے انھیں افسانوی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ کتاب سے جنگل کے چرند پرند اور دیگر حشرات الارض کے ساتھ ساتھ مختلف قدرتی اشیا سے متعلق بھی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔

صفحات: 75، قیمت:-/19 روپے

لسوما

مصنف: معصوم حمکند/ مترجم: اقبال مہدی

سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی ہماری دنیا کو نت نئی تبدیلیوں سے ہمکنار کر رہی ہے۔ بیل گاڑی سے ترقی کر کے آج انسان مریخ پر کمندیں ڈال رہا ہے۔ اس کتاب میں ان ترقیات کے پیش نظر اب سے ایک ہزار سال بعد کی دنیا کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔

صفحات: 102، قیمت-/23 روپے

مکمل موصلیت

مصنفہ: ولیپ. ایم. سالوی/ مترجم: گوہر رضا

مکمل موصلیت (سپر کنڈکٹیوٹی) دورِ جدید کی ایک اہم ایجاد ہے جس سے برقی توانائی کے میدان میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہوں گی۔ اس کتاب میں مکمل موصلیت سے متعلق تمام تفصیلات پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی ایجاد کی کہانی بھی بیان کی گئی ہے۔

صفحات: 24، قیمت: 10 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45% اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-066 110

حیدر بیابانی　　　ہماری مطبوعات سے　　　''بے زبانوں کی دنیا'' سے ماخوذ

چوہے میاں کی شادی

گلی گلی میں ہوئی منادی
ہے آج چوہے میاں کی شادی
برات ہوتی ہے وہ روانہ
جسے نہارے ہے کل زمانہ
بنے ٹھنے ہیں سبھی براتی
سجے ہیں چوہے میاں کے ساتھی
کسی نے شادی کا سٹ پہنا
کسی نے ٹوپی کسی نے گہنا
ملی ہے سسرال مال والی
ہے اُن کی دلہن کمال والی
نصیب چوہے میاں کے جاگے
غم و الم ان سے دور بھاگے
ہوئی ہے خاطر باراتیوں کی
تمام چوہوں کی ساتھیوں کی
پلاؤ زردے پکے ہوئے تھے
کباب کے ڈش سجے ہوئے تھے

سبھی نے کھایا ہے سیر ہوکر
ہنسی خوشی لوٹ آئے سب گھر
ملی ہے کتنی حسین دلہن
حسین کیا مہ جبین دلہن
بہت بڑے بل سے آئی دیکھو
جہیز بھی خوب لائی دیکھو
ٹھمک ٹھمک کے چلے گی بل میں
کتر کتر کے رہے گی بل میں
یہ اپنا خود پیٹ پال لے گی
یہ کام سارے سنبھال لے گی
شکایتوں کا نہ دے گی موقع
کرے گی سب سے سلوک ایسا
بڑوں کی عزت کرے ہمیشہ
وہ پیار بچوں کو دے ہمیشہ
مکان چوہے میاں کا ہوگا
حسین جنت کا ایک نمونہ

□□□

زندگی کو سمجھنے اور اسے بہتر بنانے میں اچھا ادب معاون ہوتا ہے ساتھ ہی اپنے پڑھنے والوں کو یہ ذہنی تفریح بھی بہم پہنچاتا ہے۔ بڑوں کی طرح بچوں کا بھی یہ حق ہے کہ ان کی ذہنی ضرورتوں کے مطابق انھیں اچھا ادب فراہم کیا جائے جو سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہو تاکہ بچے بخوشی اس کا مطالعہ کریں۔ قومی اردو کونسل نے بچوں کے لیے بڑی تعداد میں ایسی کتابیں شائع کی ہیں جو اس معیار پر پوری اترتی ہیں۔

''بے زبانوں کی دنیا'' حیدر بیابانی کی نظموں کا مجموعہ ہے جس میں مختلف جانوروں، پرندوں اور دیگر حشرات الارض کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کتاب میں چوہا، بلی، خرگوش، تتلی، شیر، گھوڑا، گدھا، مور، چیونٹی، ہاتھی، شہد کی مکھی اور دیگر جانداروں پر بے حد دلچسپ نظمیں شامل ہیں جو بچوں کو یقیناً پسند آئیں گی۔ قومی اردو کونسل کی شائع کردہ 128 صفحات کی اس کتاب کی قیمت 29 روپئے ہے۔ کونسل اپنی مطبوعات پر طلبہ کو 45 فیصد اور اساتذہ کو 40 فیصد خصوصی رعایت دیتی ہے۔

احمد نسیم صدیقی

پولینڈ کی لوک کہانی

سونے کی بطخ

اس چھوٹے لڑکے کا نام تم اپنی پسند کے مطابق کوبایا پھر زیمک سمجھ لو۔ اس کا نام کیا تھا، اس بات کا قطعی کوئی اثر اس کہانی پر نہیں پڑتا ہے۔ ہم تو یہ بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ یہ لڑکا کس کام میں ماہر تھا لیکن زیادہ تر روایات بتاتی ہیں کہ وہ جوتوں کا ماہر کاریگر تھا۔ ہاں اتنا یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک غریب لڑکا تھا اور اسے غربت قطعی پسند نہیں تھی۔

اس لڑکے کا پسندیدہ شغل یہ تھا کہ وہ شہر وارسا کی تمکا سڑک پر واقع پُر اسرار قلعے کے بارے میں سوچا کرتا جس کے بارے میں مشہور تھا کہ چھپا ہوا ہے۔ وہ ہمیشہ اس خزانے کو حاصل کرنے کے خواب دیکھا کرتا۔ یہ بھی مشہور تھا کہ قلعے کے خزانہ کی نگرانی ایک خوبصورت شہزادی کرتی ہے جس نے ایک سنہری بطخ کی صورت اختیار کر لی ہے۔

خواب دیکھتے دیکھتے آخرکار اس لڑکے نے یہ خزانہ حاصل کرنے کا عزم کر لیا۔ اس نے وستولا ندی کے کنارے واقع وارسا شہر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس شہر میں شاندار عمارتیں اور امیروں کی بڑی بڑی گاڑیاں دوڑتی تھیں۔ بالآخر وہ تمکا سڑک جا پہنچا۔ بہت دیر تک اس قدیم قلعے کو دیکھتا رہا جو طویل عرصے سے اس کے خوابوں کا مرکز تھا۔ ہمت کر کے وہ اس قلعے میں داخل ہو گیا۔ قلعہ بالکل ویران تھا اور ہر طرف اندھیرا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ برسوں سے وہاں کوئی نہیں آیا ہے۔

ایک کے بعد ایک موم بتی جلاتا ہوا وہ لڑکا ان سیڑھیوں تک جا پہنچا جو تہہ خانے میں واقع خزانے تک جاتی تھیں۔ یہ جگہ بہت خوفناک تھی۔ مکڑی کے جالے اس کے چہرے سے لپٹ رہے تھے اور دیواروں کی ٹھنڈک اس کے جسم میں سرایت کرتی جا رہی تھی۔ اس تہہ خانے کے گلیاروں میں اپنے پر پھڑپھڑاتے چمگادڑیں ملیں جن کی آوازیں مسلسل اس کے کانوں میں آ رہی تھیں۔

شاید یہاں کچھ نہیں ہے۔ لڑکے کے دل میں خیال آیا۔ ایک اور گلیارے میں تلاش کے بعد میں واپس لوٹ جاؤں گا۔

جیسے ہی وہ گلیارے کے آخر میں پہنچا، وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ اس کے سامنے ایک اندھیرا تالاب تھا جس میں خالص سونے کی ایک بطخ تیر رہی تھی۔ وہ بطخ تیرتی ہوئی اسی کی جانب آ رہی تھی۔ اور وہ لڑکا اس وقت زبردست حیرت میں پڑ گیا جب بطخ نے اسے انسانی آواز میں مخاطب کیا۔

'اچھے لڑکے، تم کو کیا چیز یہاں تک لائی ہے؟'

بطخ کی خوبصورتی کے جادو سے حواس باختہ لڑکا اپنے خوابوں اور خزانے کے بارے میں سب کچھ فراموش کر بیٹھا، اب اسے محض بطخ نظر آ رہی تھی۔ پھر اپنے دل کی بات کچھ اس طرح بتائی:

'میں صرف تم سے ملنا چاہتا تھا، تم انتہائی خوبصورت ہو۔'

'بس کیا اتنی ہی بات ہے؟' بطخ نے تعجب سے پوچھا۔

'ہاں درحقیقت اتنی ہی بات ہے۔' لڑکے نے اصرار کیا۔

اس کے بعد وہ بطخ غائب ہوگئی اور اس کی جگہ وہاں ایک حسین نوجوان شہزادی نظر آ رہی تھی جس کے حسن سے وہ تہہ خانہ روشن ہو گیا تھا۔ اس سے قبل کہ لڑکا اپنے ہوش میں آتا اور کچھ بولتا کہ شہزادی نے مسکرا کر اس سے کہا:

شکریہ! تم جیسے نیک انسان کی بدولت ہی مجھے دوبارہ انسانی شکل نصیب ہوئی ہے کیوں کہ یہ اسی وقت ممکن تھا جب کوئی ایسا شخص یہاں آئے جس کا دل دولت کی خواہش سے پاک ہو۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ تم ایک غریب لڑکے ہو اور تمھیں دولت کی ضرورت ہے۔ میں تمھیں سونے کے سو (100) ٹکڑے دوں گی مگر ایک شرط ہے۔ تم یہ تمام کل ہی اور صرف اپنے اوپر خرچ کر ڈالو۔ اس میں سے تم کسی اور کو کچھ بھی نہیں دوگے۔ اگر تم نے میری نصیحت مانی تو بہت جلد تم کثیر دولت کے مالک ہو جاؤ گے۔ دوسری صورت میں تم دوبارہ غریب بن جاؤ گے۔

اپنی خوش قسمتی پر اسے یقین نہیں ہو رہا تھا تاہم وہ سونے کے ٹکڑے لے کر سڑک پر واپس آ گیا۔ دوسرے دن وہ اس دولت کو خرچ کرنے نکل پڑا مگر یہ اتنا آسان نہیں تھا جتنا اس نے سمجھ لیا تھا۔ اس نے سب سے مہنگا کھانا کھایا اور انتہائی مہنگی شراب پی۔ اس نے بہترین ریشم اور مل مل کے لباس خریدے اور زیورات جمع کیے۔ اس نے ایک گاڑی کرائے پر لی اور شہر کی سیر پر نکل پڑا۔ اس سب کے باوجود اس کے پاس سونے کے ٹکڑے باقی تھے اور دن ختم ہونے کو آ گیا تھا۔

جب وہ فکر میں غرق اپنے مکان واپس ہو رہا تھا تو شام اندھیرے میں ایک شخص اس کے پاس آیا۔ جب وہ شخص اس کے قریب پہنچا تو لڑکے نے پایا کہ وہ ایک زردہ چہرے والا بوڑھا تھا۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور وہ سردی سے کانپ رہا تھا۔ کمزور آواز میں اس نے لڑکے سے کہا:

'محترم نوجوان' میں بھوکا ہوں اور سردی سے پریشان ہوں۔ میرے پاس کپڑے نہیں ہیں اور رات کے کھانے بھر بھی پیسے نہیں ہیں۔ میری اس حالت پر ترس کھاؤ خدا تمھیں اجر دے گا۔' لڑکا یہ سن کر شش و پنج میں پڑ گیا' ایک طرف اس شخص کی حالت زار تھی اور دوسری طرف شہزادی کا انتباہ۔ مگر وہ زیادہ دیر تک اپنے کو روک نہیں سکا۔ اس نے اپنا بٹوا نکالا اور اس شخص کے کمزور ہاتھوں میں رکھ دیا۔

اچانک ایک زوردار طوفان شروع ہو گیا۔ شہر میں پڑنے والی بارش اور تیز ہواؤں کی آواز کے اوپر شہزادی کی غضبناک آواز سنائی دے رہی تھی۔

'تم اپنے وعدے پر قائم نہیں رہے۔ تم سب کچھ گنوا دو گے اور ایک بار پھر غریب ہو جاؤ گے۔''

اس بوڑھے نے بھی یہ الفاظ سنے۔ وہ لڑکے کی جانب دیکھ کر بولا:

'' فکر مت کرو' میرے بیٹے۔ غریب وہ نہیں جس کے پاس کچھ نہ ہو بلکہ وہ ہے جو اپنی دولت میں دوسروں کو شریک نہ کرے۔ تم نے اس بوڑھے کی مدد کی ہے۔ تمھیں اس کا بہترین اجر ملے گا۔

اور ایسا ہی ہوا۔ اس محنتی لڑکے کو ایک اچھا کام مل گیا۔ ایک معمولی کاریگر سے وہ فورمین اور پھر ماسٹر بن گیا۔ اسے ایک لڑکی ملی جو اس کی بیوی بنی اور اس کے بچے اور مکان بھی ملے۔ وہ خوش اور مطمئن تھا، اب اسے کچھ نہیں چاہیے تھا۔

اور اس سونے کی بطخ کا کیا ہوا؟ ہو سکتا ہے وہ اسی اندھیرے تالاب میں ڈوب گئی ہو یا پھر اپنی خودغرضی کی خواہشوں نے اسے تباہ کر دیا ہو۔

□□□

Deptt. of Arabic
Lucknow University
Lucknow

قومی اردو کونسل کی اہم مطبوعات

کلیات محمد قلی قطب شاہ

مرتبہ: سیّدہ جعفر

گولکنڈے کا پانچواں تاجدار اور شہر حیدرآباد کا بنیاد گزار قلی قطب شاہ فنونِ لطیفہ کا قدرشناس اور خود ایک خوش فکر شاعر تھا۔ محمد قلی قطب شاہ کا یہ کلیات سیّدہ جعفر صاحبہ نے تحقیقی انداز میں مرتب کیا ہے اور اس پر انھوں نے جو مقدمہ لکھا ہے وہ نہ صرف محمد قلی قطب شاہ کی شخصیت کے تمام گوشوں کا احاطہ کرتا ہے بلکہ گولکنڈے کی تاریخ پر بھی خاطر خواہ روشنی ڈالتا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کی تصویر کے علاوہ حیدرآباد کی اہم عمارتوں کی تصویریں بھی کتاب میں دی گئی ہیں۔

صفحات 823، قیمت /175 روپے

کلیات سراج

مرتب: پروفیسر عبدالقادر سروری

سراج اورنگ آبادی کو اردو کا پہلا صوفی منش شاعر کہا جاسکتا ہے لیکن ان کی شاعری متصوفانہ کیفیات کے علاوہ بھی بہت کچھ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ ان کا یہ کلیات دکنیات کے ماہر پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم نے بڑی کاوش و کوشش کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ شروع میں مبسوط مقدمہ بھی ہے جس میں سراج کی شخصیت اور شاعری کے اہم پہلوؤں پر عالمانہ گفتگو کی گئی ہے۔

دوسرا ایڈیشن: صفحات 732، قیمت: /138 روپے

کلیات عیش

مرتبہ: ڈاکٹر حبیبہ بانو

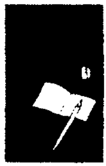

حکیم آغا جان عیش دہلوی ذوق، مومن اور غالب کے ہم عصروں میں تھے اور بہادر شاہ ظفر کے دربار میں بھی انھیں رسائی حاصل تھی۔ غالب کی مشکل پسندی پر ان کا طنزیہ قطعہ "مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے" مشہور ہے مگر غالب کی وفات پر انھوں نے جو تاریخی قطعہ بند اشعار کہے ہیں، وہ غالب سے ان کی محبت و مودت کو ظاہر کرتے ہیں۔ عیش خوش فکر شاعر تھے اور انھوں نے اپنا مرتب دیوان غزلیات اپنی زندگی ہی میں مرتب کرلیا تھا، ڈاکٹر حبیبہ بانو کے مرتب کردہ اس کلیات میں غزلوں کے علاوہ وہ دیگر اصناف سخن بھی ہیں جو عیش سے یادگار ہیں۔ مفصل مقدمے کے ساتھ۔

پہلا ایڈیشن: صفحات 556، قیمت: /80 روپے

گلشن بے خار

مصنف: نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ

یہ اردو شعرا کا مشہور تذکرہ ہے جو نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے بزبان فارسی قلمبند کیا تھا اور اس کے بعض بیانات، اس دور کے شعرا کا ذکر آئے تو آج بھی دہرائے جاتے ہیں جس سے یہ تاریخی اہمیت کا حامل تذکرہ ہوگیا ہے۔ اس اہم تذکرے کو جو حضرت میں سے شیفتہ کے زمانے تک کے ساڑھے چھ سو سے زائد شعرا اور شاعرات کے مختصر کوائف اور نمونۂ کلام پر مشتمل ہے، محترمہ حمیدہ خاتون نے اصل کتاب کے مستند نسخوں کو سامنے رکھ کر سلیس اردو میں منتقل کیا ہے اور شروع میں ایک سیر حاصل مقدمہ لکھا ہے۔

پہلا ایڈیشن: صفحات 430، قیمت /128 روپے

انیس کے مرثیے

مرتبہ: بیگم صالحہ عابد حسین

میر انیس کے مرثیوں کے متعدد مجموعے شائع ہوئے ہیں لیکن یہ ان کے پورے کلام کو محیط نہیں اور ان میں بیشتر میں صحت متن کا بھی زیادہ خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ یہ کتاب بیگم صالحہ عابد حسین نے تدوین کے جدید اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے دو جلدوں میں مرتب کی ہے جس میں انیس کے تمام دستیاب مرثیے شامل ہیں۔ ہر جلد کے ساتھ مفصل مقدمہ بھی ہے اور ایسے الفاظ کی فرہنگ بھی جو اب کم مستعمل ہیں یا معنوی تغیر سے دوچار ہوئے ہیں۔

جلد اوّل، دوسرا ایڈیشن: صفحات 540، قیمت: /36 روپے
جلد دوم، دوسرا ایڈیشن: صفحات 575، قیمت: /40 روپے

کلیاتِ فانی

مرتب: ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی

حسرت، اصغر، جگر اور فانی کو ان کی زندگی ہی میں غزل کے چار ستونوں کی حیثیت دے دی گئی تھی لیکن ان میں سے ہر شاعر کا انداز سخن جداگانہ ہے۔ فانی کی خصوصیت ان کی حزن پسندی ہے جس نے ان کے کلام میں ایک خاص اثر پیدا کردیا ہے۔ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کے مرتبہ اس کلیات میں غزلوں کے علاوہ فانی کی کہی ہوئی نظمیں، قصیدے، قطعات وغیرہ بھی شامل ہیں۔ شروع میں مرتب نے فانی کی شخصیت اور شاعری پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔

دوسرا ایڈیشن: صفحات 318، قیمت: /63 روپے

کاشف الحقائق

مصنف: سید امداد امام اثر

...امداد امام اثر کی یہ بلند پایہ تصنیف دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں یوروپی ادبیات کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے اور دوسرے حصے میں مشرقی ادبیات کی خصوصیات واضح کی گئی ہیں۔ ...شعر و ادب اور دیگر فنون لطیفہ میں جو باہمی قربت و موانست ہے، اس کا بھی ذکر ہے۔ ...حصے میں اردو شاعری کی تمام اصناف اور ہر صنف کے نمائندہ شاعروں کا تفصیلی بیان ہے جو تجزیاتی انداز کا حامل ہے۔ اس ایڈیشن کی ایک خصوصیت پروفیسر وہاب اشرفی کا مبسوط مقدمہ ہے جس میں انھوں نے کتاب کے تمام اہم پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔

دوسرا ایڈیشن: صفحات 740، قیمت /145 روپے

اڑیسہ میں اردو

مصنف: ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری

ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری کی یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں اڑیسہ میں اردو کا تاریخی اور ثقافتی پس منظر بیان کیا گیا ہے، دوسرا باب اڑیسہ میں اردو شاعری کے ارتقا اور تیسرا اردو نثر کے ارتقا کے بیان میں ہے۔ چوتھا باب دو فصلوں میں منقسم ہے اڑیسہ کا اردو اسٹیج اور اردو ڈرامے اور اڑیسہ میں اردو صحافت۔ باب پنجم چار ذیلی عنوانات پر مبنی ہے اڑیسہ میں عہد جدید میں اردو، اردو تعلیم کی صورت حال، اردو کے ادبی اور ثقافتی ادارے، اردو کی اشاعتی سرگرمیاں۔ چھٹا باب حاصل مطالعہ، کے عنوان سے ہے جس میں تمام مباحث کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔ اپنے موضوع پر ایک جامع اور مستند کتاب۔

پہلا ایڈیشن: صفحات 504، قیمت: /157 روپے

نوٹ -: طلبہ کے لیے 45 فیصد اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

RNI No. 70323/99
DL-SW-15/4104/2006-08
Date of Publication : 24/06/2006

URDU DUNIYA Monthly, July 2006, Vol. 8, Issue:7
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Secondary & Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India

قومی اردو کونسل کی اہم مطبوعات

قدیم ہندوستان کی ثقافت وتہذیب تاریخی پس منظر میں

مصنف: ڈی.ڈی.کوسمبی

مترجم: بالمکند عرش ملسیانی

ہندوستان کی تہذیب وثقافت دنیا کی چند قدیم تہذیبوں اور ثقافتوں میں سے ایک ہے۔ مشہور مورخ ڈی.ڈی.کوسمبی نے اس کتاب میں ہندوستانی تہذیب وثقافت کے سرچشموں کی نشاندہی کے علاوہ اس کی بالیدگی وترقی کا مکمل جائزہ پیش کیا ہے۔ ماقبل تاریخ عہد کی ثقافت، آریوں کی آمد اور مگدھ سلطنت کو خصوصیت سے موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

صفحات:319، قیمت-/73روپے

شیر شاہ اور اس کا عہد

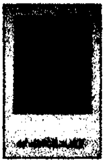

مصنف: کالکارنجن قانون گو

مترجم: رام آشرے شرما

شیر شاہ دنیا کی ان بڑی ہستیوں میں سے ایک ہے جن کے ساتھ تاریخ نے انصاف نہیں کیا ہے۔ اس کی سب سے اہم وجہ غالباً یہ تھی کہ شیر شاہ کی وفات کے دس سال کے اندر اس کا خاندان نیست ونابود ہوگیا اور زمام اقتدار پھر مغلوں کے ہاتھ میں آگئی جنھیں شیر شاہ سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ اس کتاب میں فارسی زبان کے جملہ دستیاب نسخوں اور دیگر ذرائع کی مدد سے حقائق تک پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے۔

صفحات:704، قیمت-/135روپے

تاریخ جہانگیر

مصنف: ڈاکٹر بینی پرشاد

مترجم: رحم علی الہاشمی

مغلیہ سلطنت کے چوتھے فرماں روا جہانگیر کے بارے میں لکھی گئی زیادہ تر کتابوں میں مغربی مورخین کی آراء سے استفادہ کیا گیا ہے جن کی صحت پر شک کی کافی گنجائشیں ہیں۔ اس کتاب میں پہلی مرتبہ تزک جہانگیری، اقبال نامہ اور دیگر فارسی تاریخوں، معاصر یوروپیوں کے سفرناموں اور خطوط کی مدد سے جہانگیر کے عہد حکومت کے تمام اہم سیاسی اور فوجی کارناموں کا احاطہ کیا گیا ہے۔

صفحات:365، قیمت-/90روپے

تاریخ شاہجہاں

مصنف: ڈاکٹر بناری پرشاد سکسینہ

مترجم: ڈاکٹر سید اعجاز حسین

شاہجہاں کا عہد حکومت ہندوستانی تاریخ کا ایک زریں باب سمجھا جاتا ہے۔ اس عہد میں ہر طرف امن چین اور خوش حالی تھی اور ہر طرف علم وہنر کی ترقی نظر آتی تھی۔ اسی عہد میں تاج محل، لال قلعہ اور جامع مسجد جیسے ہند مغل فن تعمیر کے بہترین نمونے بھی وجود میں آئے اور بڑے بڑے جنگی معرکے بھی سر ہوئے لیکن اسی عہد میں عظیم مغلیہ سلطنت کے زوال کے آثار بھی نمودار ہونا شروع ہوگئے تھے۔ ڈاکٹر بناری پرشاد سکسینہ نے ان تمام حقائق کا معروضی جائزہ پیش کیا ہے۔

صفحات:466، قیمت-/109روپے

جنوبی ہند کی تاریخ

مصنف: کے.اے.نیل کنٹھ شاستری

مترجم: آر.کے.بھٹناگر

اس کتاب میں جنوبی ہندوستان کی قدیم تاریخ سے سترھویں صدی کے نصف تک کی مدت کا جائزہ پیش کیا گیا ہے جس میں جنوبی ہند کے جغرافیائی حالات، آریوں کا عروج، موریہ سلطنت، ستواہن، بہمنی اور دوسری سلطنتیں اور اس کا ادب، آرٹ، مذہب اور فلسفہ وغیرہ زیر بحث آئے ہیں۔

صفحات:576، قیمت-/114روپے

علی وردی اور اس کا عہد

مصنف: کالی کنکر دتا

مترجم: عبدالاحد خاں خلیل

جب مغلیہ سلطنت کی بنیادیں کمزور ہوگئیں تو ملک کے مختلف خطوں میں خود مختار حکومتیں وجود میں آنے لگیں۔ بنگال میں علی وردی خاں نے 1740 میں اپنی حکومت قائم کی۔ اس کتاب میں علی وردی کے حالات زندگی، بنگال، بہار اور اڑیسہ پر اس کا قبضہ، مرہٹوں کے حملے، افغانوں کی بغاوت اور دیگر اہم واقعات کے ساتھ ساتھ اس عہد کی معاشی، معاشرتی اور سیاسی صورت حال پر بنیادی ماخذ کی مدد سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

صفحات:392، قیمت-/86روپے

انقلاب 1857

مرتب: پی.سی.جوشی

انقلاب 1857 ہندوستانی تاریخ کا ایک ایسا غیر معمولی واقعہ ہے جس کے ملک اور قوم پر دوررس اثرات مرتسم ہوئے۔ یہ انگریزوں کی غلامی سے نجات پانے کے لیے پہلی قومی بغاوت تھی جس نے ملکی سطح پر یکجہتی کے جذبات کو ابھارا۔ اس کتاب میں مختلف شعبۂ حیات پر اس کے اثرات پر ہندوستانی مورخین اور ادیبوں کے علاوہ غیر ملکی قلم کاروں کے بھی چند مقالات شامل کیے گئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس انقلاب کا بین الاقوامی سطح پر بھی غیر معمولی نوٹس لیا گیا۔

صفحات:359، قیمت-/75روپے

انقلاب فرانس

مصنف: جے.ایم.تھامسن

مترجم: بی.جے.سنگھ

1789 کا انقلاب فرانس تاریخ عالم کا ایک ناقابل فراموش واقعہ ہے جس نے تاریخ کے دھارے کا رخ موڑ دیا۔ آنے والے دنوں میں اس نے دنیا کی دیگر اقوام کو ظلم اور استحصال کے خلاف آواز بلند کرنے اور ظالم حکومتوں کا تختہ پلٹ دینے کا عزم وحوصلہ عطا کیا۔ اس کتاب میں اس عظیم انقلاب اور اس کے اثرات پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔

صفحات:758، قیمت:-/140روپے

نوٹ:- طلبہ کے لیے 45 فیصد اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

Printed and Published by Dr. R.K. Bhat, Principal Publication Officer, NCPUL on behalf of NCPUL and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 and published at NCPUL, West Block-1, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110066, Editor : Dr. R.K. Bhat, Tel : 26103381, 26103938